Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱۶ جنوری ۲۰۱۸ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۱ ۔ شمارہ نمبر: ۲

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱۔۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطۂ نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

افغانستان، پاکستان اور تاریخ کا ایکشن ری پلے!

ڈاکٹر عاصم اللہ بخش

یہ ۱۸۳۸ء کی بات ہے، ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ کو افغانستان کے حوالے سے اب ایک اہم فیصلہ کرنا تھا۔ روس کے ساتھ جاری تجارتی مخاصمت میں ایسٹ انڈیا کمپنی پچھڑنے لگی تھی اور اس صورتحال میں تبدیلی کے لیے ضروری تھا کہ افغانستان میں اپنی پوزیشن کو مضبوط کیا جائے۔ کابل کا بارکزئی حکمران، امیر دوست محمد خان، برطانوی مفادات کے لیے معاون ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی پنجاب کے حکمران رنجیت سنگھ کے ساتھ پشاور کے علاقے پر سخت کشمکش جاری تھی اور رنجیت سنگھ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا حلیف تھا۔ دونوں سے بیک وقت دوستی رکھنا ناممکن ہو رہا تھا۔ رنجیت سنگھ کو ناراض کرنے کا مطلب افغانستان تک براہ راست رسائی میں ایک بڑا تعطل ہوتا جبکہ کابل آسان ہدف تھا کیونکہ وہاں پر اندرونی خلفشار کی وجہ سے استحکام کا شدید فقدان تھا۔

صورتحال کو دیکھتے ہوئے گورنر جنرل نے افغانستان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہدف یہ تھا کہ وہاں پر حکمران کی تبدیلی عمل میں لا کر روس کے مقابلے میں اپنی پوزیشن بہتر بنائی جائے۔ لارڈ آکلینڈ نے اس ضمن میں ''شملہ فرمان'' جاری کر دیا اور افغانستان پر حملے کی تیاری شروع ہو گئی۔ بنیاد یہ بتائی گئی کہ دوست محمد خان روسی مفادات کے لیے کام کر رہا ہے اور اس کی سرکوبی ضروری ہے۔ رنجیت سنگھ سے رابطہ کیا گیا، اس نے حملہ میں ساتھ دینے کی حامی بھر لی لیکن ساتھ ہی دو شرائط بھی عائد کر دیں۔ اول یہ کہ اس کی افواج کابل پر حملہ میں تو ساتھ دیں گی لیکن وہ وہاں پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے ٹھہریں گی نہیں۔ دوسرا برطانوی فوج کو پنجاب سے گزر کر افغانستان جانے کی اجازت نہیں ہو گی، اس کے لیے انہیں کوئی اور راستہ اختیار کرنا ہو گا۔ برطانیہ نے کچھ ردوکد کے بعد یہ دونوں شرائط مان لیں کیونکہ اس اہم معرکہ کے لیے وہ رنجیت سنگھ کی فوجی مدد سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتے تھے۔

اب مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ افواج اور ساز و سامان کی نقل و حرکت کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا جائے۔ فوجی منصوبہ سازوں نے فیصلہ کیا کہ رنجیت سنگھ کی فوج درہ خیبر سے حملہ آور ہو گی اور برطانوی دستہ درہ بولان کے راستے افغانستان میں داخل ہو گا اور سندھ سے گزر کر وادی بولان پہنچا جائے گا۔ سندھ میں اس وقت تالپور خاندان حکمران تھا۔ ان کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی نے فوری طور پر ''دائمی دوستی'' کا معاہدہ کیا اور ساتھ ہی اپنی فوج کے لیے راہداری مانگ لی، جو انہیں فوراً ہی دے دی گئی۔

بہرحال، طے شدہ پلان کے مطابق دونوں اطراف سے افغانستان پر حملہ ہوا اور ناقابل یقین سرعت سے حملہ آور افواج کابل تک جا پہنچیں۔ دوست محمد خان کی حکومت ختم ہو گئی اور اگست ۱۸۳۹ء میں کابل کا تخت شاہ شجاع کے حوالے کر دیا گیا۔ ۱۸۴۰ء میں دوست محمد خان نے خود کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا اور اسے ایک قیدی کی حیثیت میں ہندوستان بھیج دیا گیا۔

اب کہانی کا اگلا موڑ آتا ہے۔ دنیا کی جنگی تاریخ میں ایک جنرل ایسا ہے جس نے بہت سی جنگوں میں فاتح کا کردار ادا کیا تاہم اس کا ذکر کچھ خاص کیا نہیں جاتا۔ وہ جنرل ہے ''موسمِ سرما'' نپولین اور ہٹلر کو روس میں اسی جنرل نے اصل شکست دی۔ برطانیہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہونے جا رہا تھا۔ دسمبر ۱۸۴۱ء میں دوست محمد کے بیٹے وزیر محمد اکبر خان نے کابل میں حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا اور وہاں پر تعینات برطانوی نمائندہ (فی الواقع اصل حکمران) ولیم مکاہٹن کو قتل کر دیا۔ یہ بغاوت تیزی سے پھیل گئی، ایک ماہ کے اندر برطانوی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور انہوں نے جلال آباد کی طرف پسپائی کا سفر شروع کیا۔ یہ سفر برطانوی فوجی تاریخ کا بھیانک ترین باب ثابت ہوا۔ کابل سے نکلے ۱۶۵۰۰ نفوس میں سے صرف ایک، ڈاکٹر ولیم برائڈن زندہ سلامت جلال آباد پہنچ سکے۔ باقی سب کو دشوار گزار راستوں اور سخت موسم نے لاچار کر دیا اور حملہ آوروں نے انہیں چُن چُن کر قتل کر دیا۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ اس جنگ کے بعد کابل کا تخت پھر سے دوست محمد خان کو مل گیا اور تمام تر تباہی کے بعد صورتحال پھر جوں کی توں ہو گئی۔

مندرجہ بالا معرکہ کو ''پہلی افغان'' جنگ کہا جاتا ہے۔

اندرونی صفحات پر:۔

- یمن میں بڑی تبدیلی
- خانہ جنگی کا شکار یمن
- ٹرمپ کا دورِ صدارت: امریکی کردار
- چین کے عزائم
- ۲۰۱۸ء میں ہونے والے اہم عالمی اجلاس
- امریکی فوج کی کارروائیوں میں اضافہ
- ایک اور طرح کے گمشدہ افراد

اس جنگ میں اتنی بڑی ہزیمت ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے بہت پریشانی کا سبب تھی۔ اگر یہ ایک مثال بن جاتی تو ہندوستان پر قبضہ اور ایک برتر فوجی طاقت ہونے کا تاثر، دونوں ہی خطرات کا شکار ہو سکتے تھے۔ اس لیے اپنا رعب برقرار رکھنے کے لیے کوئی جنگ جلد از جلد جیتنا از حد ضروری تھا۔ بڑی طاقتوں کی نفسیات بھی بلی کی طرح ہوتی ہیں۔ جب پاؤں جلتے ہیں تو اپنوں کو ہی پاؤں تلے دے کر بچاؤ کی کوشش کی جاتی ہے۔ اب کہ قرعہ فال ''دائمی دوستی'' والے تالپور خاندان اور سندھ کی سرزمین کے نام نکلا۔ چارلس نیپیئر کی سربراہی میں فوج سندھ کی جانب روانہ کی گئی۔ اس وقت کے حکمران میر ناصر خان تالپور نے چارلس نیپیئر سے مذاکرات کیے اور اس کی لگ بھگ تمام شرائط تسلیم کرلیں۔ یہ طے ہوا کہ نیپیئر اپنی افواج کو پیچھے ہٹالے گا۔ اس نے ایسا کرنے کا حکم بھی دے دیا لیکن پھر پلٹ کر حملہ کر دیا اور فروری ۱۸۴۳ء میں ''میانی'' کے مقام پر دونوں فوجوں کا ٹکراؤ ہوا اور انگریزی افواج نے فیصلہ کن فتح حاصل کرلی۔ پورے سندھ پر برطانیہ کا قبضہ ہوگیا جو قیامِ پاکستان تک جاری رہا۔

کہا جاتا ہے کہ افغانستان کو سمجھنے کے لیے پہلی افغان جنگ کو دیکھ لینا کافی رہتا ہے۔ اس کے بعد کے تمام معرکے قریباً اسی کا ''ایکشن ری پلے'' ثابت ہوتے آئے ہیں۔ بیرونی جارحیت کے لیے کسی ''مناسب'' سی وجہ کی تشکیل، جارحیت کا ارتکاب، جارح کی تیزی سے کامیابی، پھر اس کے خلاف بغاوت اور بالآخر تھکے ہارے جارح کی واپسی۔ یہی نہیں۔ اس میں سندھ اور تالپوروں والی تاریخ بھی دہرائی جاتی ہے۔

وہ برطانیہ کا معاملہ تھا۔ اب معاملہ امریکا سے ہے۔ یہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ انہوں نے تو جنگ ہارنے کے بعد اپنے حلیفوں پر حملہ کیا تھا، امریکا نے تو سوویت یونین کے خلاف جنگ جیتنے کے فوراً بعد پہلی پابندیاں اپنے حلیف پاکستان پر لگائی تھیں۔ جبکہ اس وقت تو اسے افغانستان میں ایک عبرتناک شکست کا سامنا ہے۔ اب وہ کیوں نہ پاکستان پر اپنا غصہ نکالے گا؟ پاکستان نے ۲۰۰۱ء میں جب امریکا کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تو وہ دراصل امریکا کا ساتھ نہیں تھا، وہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی ایک قرارداد کے پریشر سے مجبور تھا، جسے عوامی جمہوریہ چین نے پیش کیا اور اسے سلامتی کونسل کے پانچوں مستقل ممبران کی پوری حمایت حاصل تھی۔ تاہم پاکستان کو یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ ایک دن یہ بات اقوام متحدہ کے بجائے اس کے اور امریکا کے درمیان قضیہ بن کر سمٹ آئے گی اور وہ دن بالآخر آگیا۔ اسی دن کے لیے پاکستان نے اپنی تمام آپشنز امریکا کے حوالے نہیں کیے۔ اسے افغانستان میں الجھا کر رکھا اور وقت گزارتے رہے۔ آج پوزیشن یہ ہے کہ نہ وہ چین امریکا کے ساتھ کھڑا ہے، جس نے سلامتی کونسل کی قرارداد ڈرافٹ کی اور نہ ہی روس امریکا کے ساتھ ہے، جس نے سلالہ حملے کے بعد امریکا کے لیے شمالی کوریڈور فراہم کیا۔ اب حلیف بھی بدل چکے ہیں اور حریف بھی۔ امریکا کا بے بھاؤ تاؤ یہ بتاتا ہے کہ وہ ہزیمت کے اعلان سے پہلے پاکستان کو زک پہنچانے پر آمادہ ہے، تاکہ اس کی مجروح انا کی تسکین ہو سکے۔ لیکن امریکا کے لیے یہ سب براہ راست کرنا اگر ناممکن نہیں تو آسان بھی نہیں ہے۔

امریکا کی کوشش ہے کہ ایک پنتھ دو کاج کا معاملہ کیا جائے اور پاکستان کو بھارت سے یہ نقصان پہنچے تاکہ پاکستان کی سبکی بھی ہو اور بھارت کو علاقائی سپر پاور کا باقاعدہ درجہ بھی حاصل ہو جائے۔ یہ چین کو محدود کرنے کی پالیسی کا اہم ترین حصہ ہے۔ پاکستان کو اب اور بھی زیادہ چوکنا رہنا ہوگا۔ بالخصوص بھارت کے حوالے سے۔ پاکستانی میڈیا کو ایسی کسی بھی خبر کو سرخیوں میں جگہ دینے سے گریز کرنا ہوگا جس میں بھارت میں کسی عسکریت پسند حملے کا ذکر ہو۔ نہ ہی ایسا کرنے والوں کو مجاہدین وغیرہ لکھا جائے۔ بھارت نے جو بھی کرنا ہے اس سے قبل وہ گنگا ہوائی جہاز کے اغوا جیسا ڈراما ضرور کرے گا، تاکہ اسے کسی فوجی اقدام کا جواز مل سکے۔ اگر ہم اس حوالے سے نہیں چوکے تو بھارت کے لیے بھی کچھ کرنا مشکل ہوگا۔ نیز، اپنے ہاں کسی بھی دہشت گردانہ کارروائی کے خلاف نیوکلیئر تنصیبات کی حفاظتی پیش بندی بھی نہایت اہم ہے۔

پاکستان کے لیے یہ صورتحال غیر متوقع نہیں۔ تاہم یہ افسوس ضرور ہے کہ ہم اپنی غیر سنجیدگی کے باعث خود کو معاشی طور پر مضبوط نہ کر سکے اور نہ ہی سیاسی طور پر مستحکم۔ اب بھی وقت ہے۔ سیاسی استحکام کو موقع ملنا چاہیے۔ یاد رہے، تالپوروں کی شکست میں یہ ایک بہت بڑا عنصر تھا۔

(بشکریہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ ۴ جنوری ۲۰۱۸ء)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

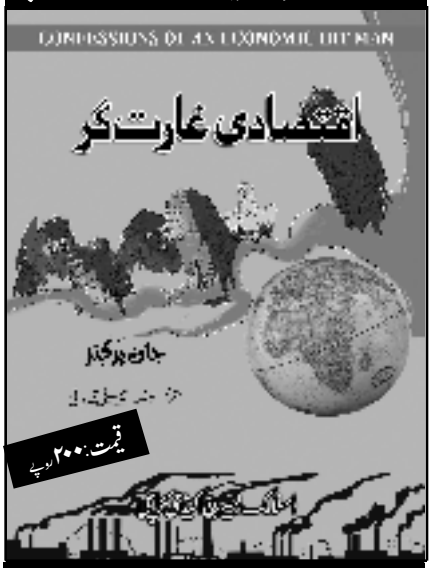

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

بقیہ: ۲۰۱۸ء میں ہونے والے اہم عالمی اجلاس

یو این ایف سی سی سی، سی او پی 24

(دسمبر 3 سے 14 تک، کیٹوس، پولینڈ)

صدر ٹرمپ کی جانب سے امریکی خارجہ پالیسی میں بہت سی تبدیلیاں کی گئیں، لیکن سب سے ڈرامائی اور تباہ کن تبدیلی پیرس میں ۲۰۱۵ء میں ہونے والے ماحولیاتی تبدیلی کے معاہدے سے دستبرداری کا اعلان تھا۔ جبکہ کینیڈا، چین، فرانس، جرمنی اور باقی دنیا نے اس معاہدے پر قائم رہنے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ یہ مختلف شہروں، صوبوں، امریکی ریاستوں اور کارپوریشنز کی شکل میں متحد ہیں اور انہوں نے مل کر اعلان کیا ہے کہ ''ہم اب بھی معاہدے پر قائم ہیں''۔ موسمیاتی تبدیلی کے موضوع پر اقوام متحدہ کا کنونشن نومبر میں بون میں منعقد ہوا، اس کنونشن میں نیویارک کے سابق میئر مائیکل بلومبرگ کے علاوہ امریکی ریاست کی کوئی نمائندگی نظر نہیں آئی، مائیکل بلومبرگ کا مقصد بھی امریکا میں کام کرانے کے لیے فنڈ اکٹھے کرنا تھا، ذہن کو تبدیل کیے بغیر وائٹ ہاؤس اگلے برس بھی پرانی پالیسی پر عمل پیرا نظر آئے گا، اور کانفرنس میں شریک رہنما پیرس معاہدے پر عمل درآمد کے لیے حتمی ہدایات اور اصول تیار کرنے پر توجہ مرکوز کیے ہوں گے، بہرحال اس حوالے سے امریکا میں سب کچھ ختم نہیں ہوگیا ہے۔ کیلیفورنیا کے گورنر جیری براؤن ۱۲ سے ۱۴ ستمبر کے دوران عالمی ماحولیاتی تبدیلی کے حوالے سے اجلاس کا انعقاد سان فرانسسکو میں کریں گے۔ یہ ایک مثال ہے کہ کیسے ماحولیاتی پالیسی بنانے کا اختیار ریاستوں، شہروں، سول سوسائٹیز اور نجی شعبے کو منتقل ہوگیا۔

(ترجمہ: سید طالوت اختر)

'Desperately seeking sherpas: Ten global summits to watch in 2018".
("cfr.org". Dec. 20, 2017)

یمن میں بڑی تبدیلی

David B. Roberts

کسی زمانے میں قطر خلیج فارس کے خطے کی ایسی ریاست تھی جو اپنے چھوٹے حجم کے باوجود بین الاقوامی تعلقات میں غیر معمولی اثر ونفوذ رکھتی تھی۔ یہ چھوٹی سی خلیجی ریاست خطے کے علاوہ افریقا کے متعدد علاقوں میں بھی غیر معمولی اثرات کی حامل تھی۔ علاقائی اور عالمی سیاست میں قطر کا بڑھتا ہوا کردار بہت سے تجزیہ کاروں کے لیے انتہائی حیرت انگیز تھا۔ پھر اچانک یہ سب کچھ ختم ہوگیا اور قطر کا مقام متحدہ عرب امارات (یواے ای) نے حاصل کرلیا۔ یواے ای اب علاقائی اور عالمی سیاست میں وقیع کردار ادا کرنے کے حوالے سے غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کررہا ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے علاقائی اور عالمی حالات نے یواے ای کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا ہے۔ زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یواے ای کی قیادت نے اب خطے میں عسکری مہمات کا حصہ بننا بھی قبول کرلیا ہے اور اسی حکمت عملی کا یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ یواے ای اب سعودی عرب کے ساتھ مل کر یمن میں بھرپور کارروائیاں کررہا ہے۔ یمن کی سرزمین پر پنپنے والی شیعہ حوثی ملیشیا کو کنٹرول کرنے کے لیے سعودی عرب اور یواے ای نے ۲۰۱۵ء میں مل کر عسکری کارروائیاں شروع کیں۔ دونوں کو یہ خدشہ ستا رہا تھا کہ حوثی ملیشیا کہیں جزیرہ نما عرب میں وہی کردار ادا نہ کرے، جو لبنان میں حزب اللہ ملیشیا ادا کررہی ہے۔ حوثی ملیشیا ملک کے بیشتر حصوں پر قابض ہوچکی تھی اور اہم بندرگاہیں بھی اس کی دسترس اور تصرف میں تھیں۔ سعودی عرب اور یمن کو یہ خوف محسوس ہوا کہ ایران حوثی ملیشیا کو غیر معمولی پیمانے پر اسلحہ فراہم کرکے معاملات کو تیزی سے اپنے حق میں کرنے کی بھرپور کوشش کرسکتا ہے۔ یمن اور سعودی عرب کی سرحد گیارہ سو کلو میٹر طویل ہے۔ ایسے میں یمن کو حوثی باغیوں کے کنٹرول میں چھوڑنے کا خطرہ کسی بھی طور مول نہیں لیا جاسکتا تھا۔

بعض خدشات بلاجواز نہیں۔ ایران اس خطے میں اپنا اثر ونفوذ بڑھانے کے لیے لبنان اور شام میں باغی گروپوں کی بھرپور حمایت اور مدد کرتا رہا ہے۔ ایک بڑے حریف (سعودی عرب) کو مشتعل کرنے یا پھر اپنے اسٹریٹجک مفادات کو تقویت بہم پہنچانے کے لیے، اب تک کے حالات کی بنیاد پر، اس بات کا پورا امکان موجود تھا کہ ایرانی قیادت یمن کے حوثی باغیوں کی بھرپور حمایت و مدد کرتی۔ ۲۰۱۵ء سے پہلے تک کی صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک تجزیہ کار نے کہا کہ ایران نے یمن کے معاملے میں معمولی سی ''سرمایہ کاری'' کی تھی اور اس کا صِلہ بھی محدود ہی تھا۔ ایران نے یمن کے باغیوں کو اتنے زیادہ ہتھیار فراہم نہیں کیے کہ اندرونی سطح پر طاقت کا توازن بُری طرح بگڑ کر رہ جائے۔

حوثی باغیوں پر ایران کا کنٹرول ایک متنازع معاملہ ہے اور اب یہ خبریں بھی آرہی ہیں کہ باغیوں کے لیے ایران کی مدد میں غیر معمولی اضافہ ہوچکا ہے یعنی فنڈ بھی دیے جارہے ہیں اور اسلحہ بھی۔ ایران نے حوثی باغیوں کو جدید ترین ہتھیاروں کی فراہمی یقینی بنانے کی کوشش کی ہے۔ سعودی عرب میں دور تک داغے جانے والے حوثی باغیوں کے میزائلوں میں ایرانی پُرزے پائے جارہے ہیں۔ ویسے اقوام متحدہ نے ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ اب تک واضح نہیں حوثیوں کو میزائلوں کے لیے پُرزے کہاں سے مل رہے ہیں یا انہیں بنے بنائے میزائل کون فراہم کررہا ہے۔

اسکور کارڈ ملا جلا ہے۔ حوثی باغی اب بھی سعودی علاقوں میں میزائل داغ رہے ہیں۔ اب وہ زیادہ اچھی طرح نشانہ لے کر میزائل داغ رہے ہیں اور یہ سب کچھ کسی کی واضح مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ سعودی فورسز کے لیے سب سے بڑا چیلنج ان میزائلوں کو اہداف تک پہنچنے سے روکنا ہے۔ اس حوالے سے سعودی فورسز کی صلاحیت کو قابل رشک قرار نہیں دیا جاسکتا۔ حوثی باغیوں کے پاس جدید عسکری ٹیکنالوجی کسی حد تک موجود ہے۔ مثلاً وہ ڈرون کے ذریعے حملے کرسکتے ہیں اور ریموٹ کنٹرول بم بھی استعمال کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ یمن میں حوثیوں کو اب بھی ایک طاقت کا درجہ حاصل ہے تاہم ان کے تصرّف میں کم ہی علاقے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سعودی عرب اور یواے ای نے مل کر کم از کم ایک بڑا مقصد ضرور حاصل کرلیا ہے۔

اس خطے میں ایک بڑا مسئلہ مذہبی انتہا پسند گروپوں کا فروغ بھی ہے۔ متحدہ عرب امارات کے لیے یہ بہت بڑا مسئلہ رہا ہے۔ اس نے مذہبی انتہا پسند گروپوں کو کنٹرول کرنے کے معاملے میں علاقائی اور عالمی سطح پر اتحادی ہونے کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ متحدہ عرب امارات نے القاعدہ برائے جزیرہ نما عرب (اے کیو اے پی) کو کنٹرول کرنے سے متعلق جو کوششیں اب تک کی ہیں وہ بہت حد تک ناکام رہی ہیں۔ القاعدہ نے جزیرہ نما عرب میں قدم جمانے کے حوالے سے تشویشناک حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔

۲۰۱۶ء میں شورش کے خلاف آپریشن شروع کیے جانے کے صرف چھ ماہ کے اندر یواے ای فورسز نے یمن کے ایک صوبائی دارالحکومت مکلّا کا کنٹرول حاصل کرنے میں کامیابی پائی۔ یہ شہر ایک سال سے بھی زائد مدت سے القاعدہ کے کنٹرول میں تھا۔ یہ کامیابی ضرور تھی مگر ایسی بھی نہیں کہ اس پر زیادہ فخر کیا جائے۔ القاعدہ نے بعد میں کہا تھا کہ شہریوں کو قتل وغارت سے بچانے کے لیے اس نے مکلّا کا کنٹرول خود ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ القاعدہ نے پسپائی ضرور اختیار کی تھی مگر اُسے شکست سے دوچار نہیں کیا جاسکا تھا۔ متحدہ عرب امارات نے متعدد چھوٹے مقامی گروپوں کو نئے سرے سے منظّم کیا، ہتھیار فراہم کیے اور امریکا سے فضائی مدد بھی دلائی۔ ان گروپوں نے متعدد شہروں اور قصبوں کا کنٹرول حاصل کیا ہے۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے مگر یہ احساس یا تاثر اب تک باقی ہے کہ القاعدہ نے بہت سے مقامات سے پیچھے ہٹنا گوارا کیا تو یہ کمزوری کا نشان نہ تھا بلکہ حکمت عملی کا تقاضا تھا۔ آثار بتا رہے ہیں کہ القاعدہ اپنی طاقت جمع کرنے میں مصروف ہے۔ پسپا ہونے کا بنیادی مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ معاملات پر خوب غور کیا جائے اور ایک بڑے دشمن سے ٹکرا کر طاقت ختم کرنے کے بجائے مناسب وقت کا انتظار کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ القاعدہ ایک بار پھر مضبوط ہوکر ابھر سکتی ہے اور اس بار بھی وہ متعلقہ فورسز کے لیے بڑا دردِ سر بنے گی۔

عالمی برادری القاعدہ اور دیگر انتہا پسند گروپوں کے خلاف متحد ہے۔ متحدہ عرب امارات بھی اس معاملے میں عالمی برادری کا ہم نوا ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ وہ اخوان المسلمون سے نظریاتی ہم آہنگی رکھنے والے گروپ ''اصلاح'' کے خلاف بھی ہے۔ یوں متحدہ عرب امارات ان چند ریاستوں میں سے ہے، جو اخوان اور اس سے تعلق رکھنے والے گروپوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس معاملے میں اس کے سعودی عرب سے بھی اختلافات رہے ہیں۔ یواے ای کی قیادت ایسے تمام گروپوں سے دور رہنا چاہتی ہے، جو اسلام کو سیاست میں بھی کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں اور حکمرانی کا معیار بلند کرنے کے

لیے اسلام کو بنیادی وسیلہ بنانے پر زور دیتے ہیں۔

ایسے میں گزشتہ دسمبر کے وسط میں متحدہ عرب امارات کے ڈی فیکٹو راہنما محمد بن زاید النہیان اور سعودی ولی عہد محمد بن سلمان کے ساتھ یمن کی اصلاح پارٹی کے قائدین محمد عبداللہ الیدومی اور عبدالوہاب الاغبیی کو دیکھ کر بہت سوں کو حیرت ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یمن کے حوالے سے متحدہ عرب امارات نے اپنی حکمت عملی تبدیل کر لی ہے۔ بات یہ ہے کہ متحدہ عرب امارات نے سب سے کم بُرے آپشن کے طور پر سابق صدر علی عبداللہ صالح سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ اُس کا اندازہ تھا کہ علی عبداللہ صالح ایک بار پھر اقتدار میں آ کر یمن کو نئی زندگی دیں گے۔ جب وہ مارے گئے تو یو اے ای کے پاس یہی آپشن بچا کہ اصلاح پارٹی کے قائدین سے ہاتھ ملایا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ یو اے ای نے اصلاح پارٹی پر زور دیا کہ وہ اخوان المسلمون سے ترکِ تعلق کرے۔ جب اصلاح پارٹی ایسا کرنے پر رضامند ہوئی تو یو اے ای نے معاملات کو درست کرنے کی غرض سے اس سے ہاتھ ملایا اور یوں ایک نئی شراکت داری شروع ہوئی۔ یہ سب کچھ زمینی حقائق کی روشنی میں ہوا۔

حکمتِ عملی کے حوالے سے دیکھیے تو یمن میں حوثی اب کمزور پڑ چکے ہیں۔ اصلاح پارٹی ماضی میں طاقت کے کھیل کا حصہ رہی ہے۔ اسے شمال اور جنوب دونوں ہی علاقوں میں مقبولیت حاصل رہی ہے۔ سعودی عرب کی قیادت میں قائم اتحاد سے ہاتھ ملانے پر اصلاح پارٹی کی پوزیشن مستحکم تر ہو چلی ہے اور حوثیوں کے لیے امکانات گھٹتے جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک نیا یمن منصۂ شہود پر ابھرنے والا ہے۔

حوثیوں اور اصلاح پارٹی کا سیاسی اتحاد تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔ ویسے یمنی سیاست نے ڈیڑھ دو عشروں کے دوران بہت سے سیاسی اتحاد بنتے اور ٹوٹتے دیکھے ہیں۔ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات پر مشتمل اتحاد کو یمن میں ایک مضبوط اتحادی مل گیا ہے۔ عملی اعتبار سے اب یمن میں چند ایک بڑی کامیابیاں زیادہ دور کی بات نہیں۔ وسطی یمن میں امکانات بہتر ہوں گے۔ اب چند بڑے اور اہم شہروں اور طاقت کے مراکز پر اصلاح پارٹی کا تصرّف زیادہ مشکل کام نہ ہوگا۔ اتحادی افواج اب وسیع تر کامیابیوں کے لیے پر تول رہی ہیں۔

یو اے ای نے یمن میں اپنے مفادات کو زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرنے کے لیے ایک طرف تو ہم خیال گروپوں کو زیادہ منظّم اور مسلح کرنے کی بھرپور کوشش شروع کر دی ہے اور دوسری طرف جنوبی یمن میں تعمیر نو کا عمل بھی شروع کرایا ہے تاکہ مقامی باشندوں میں نیا اعتماد پھونکا جا سکے۔ یو اے ای کی قیادت یمن پر غیر معمولی توجہ دے رہی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سعودی عرب اس کے ساتھ ہے اور سعودی عرب کو کسی بھی معاملے میں انکار کرنا اس کے لیے اب تک ممکن نہیں رہا۔

ایک بڑی رکاوٹ اب بھی باقی ہے۔ یمن میں اپنے ہم خیال لوگوں کو بہتر پوزیشن میں لانے کے لیے سعودی عرب اور یو اے ای نے مل کر جو عسکری کارروائیاں کیں اُس کے نتیجے میں غیر متعلق اموات بھی بڑی تعداد میں ہوئی ہیں۔ علی عبداللہ صالح کی ہلاکت کے موقع پر ۱۳۶ سے زائد افراد بلاجواز موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ امریکا نے ڈرون حملوں کے ذریعے القاعدہ کے اہم راہنماؤں کو ختم ضرور کیا مگر اس عمل میں اس نے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلائی اور اموات بھی واقع ہوئیں۔ عسکری کارروائیوں میں شہریوں کی ہلاکت پر یمن کے شہری برہم ہیں۔ ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے حوالے سے اب تک خاطر خواہ اقدامات نہیں کیے گئے۔ سعودی عرب نے یمن کی بندرگاہوں کی ناکہ بندی بھی کی تھی جس کے نتیجے میں حالات بد سے بدتر ہوئے۔ خوراک، ادویہ اور دیگر ضروری اشیا کی شدید قلت رونما ہوئی۔ یہ اطلاعات بھی ہیں کہ اتحادیوں نے یمن میں نجی عقوبت خانے قائم کر رکھے ہیں، جن میں مخالفین پر بدترین تشدد کیا جاتا ہے۔ یہ عقوبت خانے بظاہر امریکا کی سرپرستی میں کام کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ سعودی عرب اور یو اے ای پر مبنی اتحاد کی اخلاقی اتھارٹی کو کمزور کرنے کے لیے کافی ہے۔

بہر حال، جغرافیے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یمن کی سرحد سعودی عرب اور عمان سے ملتی ہے۔ حوثی میزائل ۶ میں سے ۵ خلیجی ریاستوں کے دارالحکومت تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک خاص تناظر میں سوچا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ علاج نے بیماری کو بڑھا دیا ہے۔ متحدہ عرب امارات نے حوثی باغیوں کو اقتدار سے دور رکھنے کے لیے جو آپریشن کیا اس کے نتیجے میں کئی دوسرے گروپ مضبوط ہو گئے، جو بہتر حکمرانی کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بڑے پیمانے پر غیر متعلق قتل و غارت نے مختلف طبقات میں شدید نفرت پیدا کی ہے۔

سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کو یمن میں اچھی طرح قدم جمانے ہیں تو بڑے پیمانے پر تعمیر نو کا عمل شروع کرنا پڑے گا۔ انتہا پسندوں کے ہاتھوں میں کھیلنے کے بجائے اتحادیوں کو ایسے اقدامات کرنا ہوں گے، جن سے عوام کا ان پر اعتماد بڑھے اور ملک امن و استحکام کی راہ پر گامزن رہے۔ حوثیوں نے ملک میں بڑے پیمانے پر قتل و غارت پھیلائی ہے۔ وہ لڑائی کے معاملے میں انتہائی ہلاکت خیز اور سفاک ثابت ہوئے ہیں۔ اب یہ اتحادیوں کا کام ہے کہ انہیں زیادہ سے زیادہ کمزور کرنے پر توجہ مرکوز کریں۔ اصلاح پارٹی کے بین الاقوامی رابطے ختم کر کے اسے گلے لگا کر اتحادیوں نے خاصی حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ نیا اتحاد یمن میں حقیقی استحکام کی راہ ہموار کرنے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"UAE embrace of Islah marks major shift in Yemen". ("agsiw.org". January 2, 2018)

بنگلا دیش جماعت اسلامی کے سابق ممبر پارلیمنٹ سمیت ۶ افراد کو موت کی سزا

بنگلا دیش کی ایک خصوصی عدالت نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں کیے گئے جرائم کی پاداش میں ۶/افراد کو سزائے موت سنا دی ہے۔ سزا یافتہ افراد میں جماعت اسلامی کے سابق ممبر پارلیمنٹ مولانا عبدالعزیز سمیت روح الامین، عبداللطیف، نجم الہدیٰ، عبدالرحیم اور ابومسلم شامل ہیں، جن میں پانچ افراد کی عمریں ۱۹۷۱ء میں ۱۸ سال سے کم بتائی جاتی ہیں۔ جرائم کی تفصیلات میں لوٹ مار، اغوا اور قتل شامل ہیں۔ سزا پانے والوں میں ۵ افراد مفرور قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ عبداللطیف جیل میں ہے۔

عدالت نے حکم نامے میں کہا کہ سزا یافتہ افراد کے خلاف الزامات ثابت ہو چکے ہیں اور ملزمان کے خلاف موت کی سزا پر پھانسی کی شکل میں عمل درآمد کیا جائے گا۔

بنگلا دیش کی جماعت اسلامی کے قائم مقام امیر پروفیسر مجیب الرحمٰن نے عدالتی فیصلے پر اپنے سخت تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے مقدمے کو حکومتی سازش قرار دیا ہے۔

یہ بات پیش نظر رہے کہ ۱۹۷۱ء میں مولانا عبدالعزیز کی عمر ۱۹ سال، روح الامین کی عمر ۱۵ سال، ابومسلم کی عمر ۱۳ سال، عبداللطیف کی عمر ۱۵ سال، نجم الہدیٰ کی عمر ۱۴ سال اور عبدالرحیم کی عمر ۱۶ سال تھی۔ تاہم ۵/افراد کے ۱۸ سال سے کم عمر ہونے کی وجہ سے عدالتی فیصلے کو جانبدارانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

| | |

خانہ جنگی کا شکار یمن

ساحلی شہر حدیدہ سے یمن کے دارالحکومت صنعا جانے والی سڑک کے ساتھ سنگلاخ پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ ان پہاڑوں کو کاٹ کر راستہ بنایا گیا ہے۔ ساحل پر پرانے تعمیر شدہ فارم ہاؤسز موجود ہیں، فارم ہاؤسز کے گرد پہاڑ سے نیچے آنے والا بارش کا پانی جمع ہے، جنوب میں گھنے جنگلات ہیں، جہاں بون اور جنگلی بلیاں رہتی ہیں۔ یمن کا وسیع صحرا مشرق تک پھیلا ہوا ہے۔ علاقے کی دلکشی متاثر کن ہے، مگر یہ سب قدرتی خوبصورتی ہے۔ حقیقت میں تو زمین کا یہ خطہ مصائب کی آماجگاہ بن چکا ہے۔

۲۰۱۴ء میں حوثی باغیوں اور حکومت کے درمیان جنگ کے آغاز سے قبل بھی یمن مشرق وسطیٰ کا سب سے غریب ملک تھا۔ جنگ نے غربت میں خطرناک حد تک اضافہ کر دیا ہے، جب سے جنگ کا آغاز ہوا ہے یمن موجودہ دور کی ہیضے کی بدترین وبا کا شکار ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ملک بدترین خشک سالی کے کنارے کھڑا ہے، ایسی خشک سالی جو دنیا میں دہائیوں بعد دیکھی جاتی ہے۔ جنگ نے پانی، تعلیم اور صحت کے نظام کو مکمل طور پر تباہ کر دیا ہے، اقوام متحدہ کا کہنا ہے کہ یمن میں بدترین انسانی بحران کا سامنا ہے۔ دو کروڑ ۸۰ لاکھ لوگوں کو مدد کی ضرورت ہے، یہ کل آبادی کا تین چوتھائی بنتا ہے۔ یمن میں جنگ اور بدترین انسانی بحران کو باہر کی دنیا نے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا ہے، اس تنازعے کی جڑیں کافی پرانی ہیں اور اب اس میں نئے گروہ اور یمن کے پڑوسی ممالک شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن کوئی بھی طاقت ایسی نہیں ہے جو پورے ملک کو متحد رکھے اور امن قائم کر سکے۔ یمن کا انفرااسٹرکچر کافی سالوں سے تباہ حال ہے، اس لیے باہر سے آنے والوں کے لیے اندازہ لگانا مشکل ہے کہ عمارت دھماکا خیز مواد سے تباہ ہوئی یا دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے۔ سعودی اتحاد کی بمباری سے تباہ ہونے والی عمارتوں کی نشاندہی صرف مقامی لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ امریکی اور برطانوی ماہرین کی جانب سے اہداف کا انتخاب کرنے میں سعودیوں کی مدد اور انہیں انتہائی جدید اور زبردست گائیڈیڈ بم فراہم کرنے کے باوجود اکثر فضائی حملوں میں غلط جگہوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ حوثی باغی حملوں کا سب سے بڑا ہدف ہیں۔ حوثی یمن میں اصلاحات اور اقتدار میں کم حصہ ملنے سے ناخوش تھے۔ حوثی اپنے گڑھ شمالی علاقوں سے نکل کر ۲۰۱۴ء میں صنعا پر قابض ہو گئے، جس کے بعد حوثیوں نے جنوب کی جانب پیش قدمی کی اور یمن کے اکثر علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

انہیں ایران اور سابق آمر علی عبداللہ صالح کی حمایت حاصل تھی۔ صدر ''منصور ہادی'' پہلے شمالی بندرگاہ عدن فرار ہوئے، پھر سعودی عرب چلے گئے، جہاں وہ اب بھی موجود ہیں۔ ان کی درخواست پر سعودی عرب نے مقامی افواج کی مدد کے لیے قدم اٹھایا تھا۔ سعودی اتحاد نے بمباری کے دوران فیکٹریوں، کھانے کی اشیا کے گوداموں کے ساتھ صنعا کے ہوائی اڈے کو بھی نشانہ بنایا۔ دارالحکومت صنعا سے حدیدہ جاتے ہوئے راستے میں بمباری کے نشانات جابجا نظر آتے ہیں۔ بحری جہازوں سے سامان اتارنے کے لیے بندرگاہ پر لگی کرینوں کو فعال کر دیا گیا ہے، اب بندرگاہ اپنی سابقہ صلاحیت کے مطابق کام کر رہی ہے۔ ایک ماہ قبل امریکا نے نئی کرینیں فراہم کرنے کی کوشش کی تھی مگر خلیجی اتحادی رکاوٹ بن گئے۔ بحری اور ہوائی جہاز کے ذریعے سے کھانے پینے کی اشیا، ایندھن اور ادویات کی فراہمی جاری ہے۔ اقوام متحدہ اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ ان جہازوں کے ذریعے اسلحہ فراہم نہ کیا جائے، مگر اس کے باوجود سعودی اتحاد نے ان جہازوں کا راستہ روک رکھا ہے۔ نومبر میں دو ہفتے تک شمالی بندرگاہ کی ناکہ بندی کر کے جہازوں کو جانے سے روک دیا گیا، ایسی رکاوٹ سے لوگوں کی تکالیف میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ ایندھن کی کمی کی وجہ سے پمپنگ اسٹیشن پانی فراہم نہیں کر پاتے، اس لیے مقامی لوگ پانی کو ذخیرہ کرنے کے لیے گندی اور کھلی جگہ استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ ہیضے کی شکل میں نکلتا ہے، اور اس بیماری کے علاج کے لیے آنے والی ادویات کو بھی اتحادیوں کی جانب سے روک لیا جاتا ہے۔ بمبار طیاروں سے کچھ بھی محفوظ نہیں ہے، جنگ شروع ہونے کے بعد پہلے چھ ماہ میں ۴۰ بنیادی صحت کے مراکز کو نشانہ بنایا گیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اسپتالوں، اسکولوں، بازاروں اور مسجدوں کو اتحادیوں کی جانب سے جان بوجھ کر نشانہ بنائے جانے کا الزام لگایا ہے۔ ایمنسٹی کا کہنا ہے کہ جنگ میں انتہائی تباہ کن ہتھیاروں کے ساتھ کلسٹر بم بھی استعمال کیے جا رہے ہیں، کلسٹر بم کے استعمال پر کئی ممالک نے پابندی لگا رکھی ہے۔ اتحادیوں کے ترجمان نے ایک بار پچاس ہزار کی آبادی والے پورے شہر کو فوجی ہدف قرار دے دیا تھا۔ یہاں ''علی مرحاد'' ایک دہائی سے رہائش پذیر تھے، جنگ کے بعد وہ گھر چھوڑ کر مزراق کے پناہ گزین کیمپ میں منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے۔ ۲۰۱۵ء میں ان کے علاقے میں بمباری کی گئی، جس میں ان کے دو بیٹوں سمیت ۴۰ افراد مارے گئے۔ علی مرحاد کا کہنا تھا کہ ''بمباری کے بعد میں کیمپ منتقل ہو گیا'' اس سال کے آغاز میں بھی اتحادیوں کی بمباری کے دوران ایک اور بم ان کے گھر کے قریب گرا۔

یہ حالات یمن کے عام شہریوں کے جنگ سے محفوظ رہنے کی مشکلات کو ظاہر کرتے ہیں، جنگ اور بمباری سے کم از کم ۱۰ ہزار عام شہری مارے جا چکے ہیں، جبکہ اس سے ۴۰ گناہ زیادہ افراد شام میں ہلاک ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے پناہ گزینوں کا طوفان یورپ پہنچا۔ شاید اسی وجہ سے شام کی جنگ نے بھرپور عالمی توجہ حاصل کی، جبکہ یمن جنگ کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔ برطانیہ کے پچاس فیصد عوام اس جنگ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ شام میں ہلاکتوں کی زیادہ تعداد سے گمراہ کیا جا رہا ہے۔

یمن میں جنگ سے زیادہ لوگ خوراک اور ادویات نہ ملنے کی وجہ سے جان سے گئے ہیں، مگر خوراک اور ادویات کی کمی جنگ کا نتیجہ ہے اور جنگ جاری ہے۔ یمن میں جنگ کوئی غیر معمولی بات نہیں، جزیرہ نما عرب کا جنوب مغربی کنارہ ہونے کی وجہ سے یہ ایک اہم تجارتی راستہ ہے، اس پر بیرونی طاقتیں متعدد مرتبہ حملہ کر چکی ہیں۔ گزشتہ صدی میں یہ ملک درجن بھر تنازعات کا شکار رہا، جس میں کئی ممالک ملوث تھے۔ موجودہ جنگ کی کچھ بنیادیں ۱۹۶۰ء کی جنگ سے جا کر ملتی ہیں، جب شمال میں خانہ جنگی جاری تھی اور جنوب میں برطانیہ کے خلاف بغاوت ہو گئی تھی۔ یمن میں دو ریاستوں نے جنم لیا، شمال میں رہنماؤں نے اپنے اقتدار کے جواز کے لیے مذہبی علما کی حمایت حاصل کی، جنوب میں سیکولر رہنماؤں نے مارکس ازم کو اپناتے ہوئے سوویت یونین سے اتحاد قائم کر لیا۔ سیاسی تنازعات ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۹ء میں جنگ کی وجہ بنے، مگر خراب معاشی حالات اور سوویت یونین کے خاتمے نے دونوں ریاستوں کو پھر ایک کر دیا۔ ۷۰ اور ۸۰ کی دہائیوں میں ہونے والے ناکام معاہدوں کے بعد شمال اور جنوب نے ۱۹۹۰ء میں نئے آئین پر اتفاق کر لیا، اس امید پر کہ اتحاد کے مظاہرے سے غیر ملکی سرمایہ کاروں کو راغب کر کے یمن میں زیادہ سے زیادہ تیل نکالا جا سکے گا۔ مختصر عرصے کے لیے سرمایہ ملک میں آیا اور تیل باہر گیا، مگر پھر خانہ جنگی پھیل گئی، جس میں جنوب سے تعلق رکھنے والے صالح کی

فوج نے کامیابی حاصل کی، جس کے نتیجہ میں جنرل پیپلز کانگریس پارلیمان میں اکثریت حاصل کرکے مضبوط طاقت بن گئی۔۲۰۰۳ء میں پارلیمانی انتخابات کو ملتوی کردیا گیا اور مخالفین کو حراست میں لے لیا گیا، صالح اور ان کے ساتھی سمجھتے تھے کہ ریاست کے اربوں ڈالر وہ لوٹ لیں گے۔ یمن کے اکثر شہریوں کی روز کی آمدن ۳ ڈالر سے بھی کم ہے۔

شیعہ فرقہ زیدیہ یمن کی آبادی کا ۴۰ فیصد ہے، اس فرقے نے محسوس کیا کہ ان کو دیوار سے لگا دیا گیا ہے۔ حالانکہ خود صالح کا تعلق بھی اسی فرقے سے ہے۔ حوثیوں نے ۱۹۹۰ء میں زیدیہ فرقے سے ہی جنم لیا۔ سعودیوں کے قدامت پسند مذہبی اثرات اور یمن و امریکا کے دہشت گردی کے خلاف اتحاد کے بعد حوثی کافی مضبوط ہوگئے، صالح نے حوثیوں پر اپنی حکومت کے خلاف بغاوت کی کوشش کرنے کا الزام بھی لگایا۔ ۲۰۰۴ء سے ۲۰۱۰ء تک حوثیوں اور حکومتی فوج میں جنگ کے نتیجے میں سیکڑوں لوگ ہلاک ہوگئے، جس میں حوثیوں کے قائد حسین بدرالدین بھی شامل ہیں۔ ۲۰۱۱ء میں عرب بہار کے دوران صالح حکومت کے خلاف ہزاروں لوگ سڑکوں پر نکل آئے، خلیجی ممالک کے دباؤ پر صالح نے ۲۰۱۲ء میں اقتدار نائب صدر ''ہادی'' کے حوالے کردیا، جس کے بعد مختصر عرصے کے لیے کچھ امید پیدا ہوئی۔ ۲۰۱۴ء میں اقوام متحدہ کے زیرنگرانی نئے وفاقی اور پارلیمانی آئین کے تشکیل کا منصوبہ پیش کیا گیا، تاکہ جنوب اور شمال میں تقسیم کو کم کیا جاسکے، لیکن حوثیوں کی حکومت پر بداعتمادی قائم رہی اور انہوں نے ۲۰۱۲ء میں انتخابات کا بائیکاٹ کردیا، جس میں ہادی کو فتح حاصل ہوئی۔ حوثیوں نے ۲۰۱۴ء کے معاہدے کے مخالفت بھی کی، ان کا موقف تھا کہ اس طرح وہ محدود وسائل کے ساتھ علاقے میں پھنس جائیں گے اور سمندر بھی پہنچ سے دور ہو جائے گا۔ انہیں حکومت میں وہ مقام بھی حاصل نہیں ہوا جو وہ چاہتے تھے، ان کے ساتھ صالح بھی شامل ہوگئے۔ صالح نے یمن میں تبدیلی کو کمزور سمجھا اور اقتدار دوبارہ حاصل کرنے یا بیٹے کو منتقل ہونے کی امید پر حوثیوں سے اتحاد کیا۔ صدر ہادی سے ناراضی اور اصلاح (اخوان سے منسلک اسلامی پارٹی) کی بڑھتی ہوئے طاقت سے خوفزدہ ہوکر صالح اور حوثیوں نے ۲۰۱۴ء میں غیر فطری اتحاد قائم کرلیا۔ اسی برس ستمبر میں اس اتحاد کے جنگجو صنعا میں داخل ہوگئے۔ ہادی کی غیر مؤثر حکومت سے مایوس بہت سے مقامی شہریوں نے صنعا میں ان جنگجوؤں کا استقبال کیا۔ اقوام متحدہ کے زیرنگرانی حوثیوں اور حکومت کے درمیان اقتدار کی تقسیم کے لیے ہونے والے معاہدے کو مکمل طور پر نظرانداز کردیا گیا۔ ۲۰۱۵ء کے آغاز میں باغیوں نے دارالحکومت کا مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے بعد مارچ تک عدن پر بھی قبضہ کرلیا۔ بہرحال یہ واضح ہوگیا کہ حوثیوں نے یمن پر حکومت کرنے کی کوئی منصوبہ بندی نہیں کی تھی، ان کے زیرقبضہ علاقوں میں گندگی کا ڈھیر لگا ہوا ہے، نقد رقم پاس رکھنا خطرے سے خالی نہیں، علاقے میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ کرائسس گروپ سے تعلق رکھنے والے لونگلے کا کہنا ہے کہ ''میرے خیال میں حوثیوں کے پاس کبھی بھی سیاسی ایجنڈا نہیں رہا، چاہے وہ صالح سے جنگ کا زمانہ ہو یا اتحاد کا''۔ حوثیوں کی نااہلی کی وجہ سے سعودی اتحاد کو مداخلت کا موقع ملا۔ یمن میں سعودی مداخلت کوئی نئی بات نہیں، ۱۹۳۴ء میں سعودی فوجیوں نے زیدیوں کے زیرقبضہ علاقہ دوبارہ حاصل کیا۔ اس وقت سعودیوں کی کمان شہزادہ سعود کررہے تھے جو بعد میں بادشاہ بھی بنے، آج شہزادہ محمد بن سلمان بھی تخت کے وارثوں میں پہلے نمبر پر ہیں، انہوں نے یمن میں مداخلت کا منصوبہ بظاہر مضبوط قائد کی شہرت حاصل کرنے کے لیے بنایا تھا، مگر محمد بن سلمان نے سعودی عرب کو ایک دلدل میں پھنسا دیا ہے۔ صدر ہادی کی مدد کی اپیل کے جواب میں شہزادہ محمد بن سلمان نے مصر، مراکش، اردن، سوڈان، کویت، امارات، قطر اور بحرین پر مشتمل ممالک کا اتحاد قائم کیا، اس اتحاد نے مارچ ۲۰۱۵ء میں یمن پر فضائی اور سمندری حملوں کا آغاز کیا، ایک ماہ بعد سعودیوں نے فضائی حملے بند کرنے کا اعلان کردیا۔ سعودی حکام کا کہنا تھا کہ ''ہم نے عسکری اہداف حاصل کرلیے ہیں''۔

سعودیوں کی جانب سے جنگ کے خاتمے کا اعلان حقیقت میں جنگ کا آغاز تھا۔ کسی نئے آپریشن کا مقصد سیاسی حل کے لیے ماحول بہتر بنانا ہونا چاہیے تھا، مقامی جنگجوؤں نے اتحادیوں کے فضائی حملوں کی مدد سے حوثیوں کو پیچھے دھکیل دیا، تاہم وہ حوثیوں سے شمالی علاقے واپس لینے میں ناکام رہے، جس میں صنعا بھی شامل ہے۔ یہ شمالی علاقوں پر سعودی اتحاد کے زیادہ توجہ دینے کے بعد کا نتیجہ تھا، سعودیوں نے تباہ حال یمن کی مصیبت میں بے پناہ اضافہ کیا اور الزام دوسروں پر لگا دیا۔ دوسری طرف حوثیوں اور صالح کے جنگجوؤں نے بھی شہریوں پر بلاتفریق حملے کیے، جس میں عدن اور تعز شہر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے عام شہریوں کو امداد کی فراہمی میں رکاوٹ ڈالی، ان پر جنگ سے پیسے کمانے کے الزامات بھی لگائے گئے ہیں۔ ہادی نے الزام لگایا ہے کہ ''حوثیوں نے مرکزی بینک سے ۴ ارب ڈالر لوٹ لیے تاکہ جنگی اخراجات ادا کیے جاسکیں''۔ حوثیوں کا کہنا تھا کہ یہ رقم ادویات اور کھانے پینے کی اشیا پر خرچ کی گئی ہے، ۲۰۱۶ء میں ہادی نے مرکزی بینک کو صنعا سے عدن منتقل کردیا اور شمال میں موجود سرکاری اہلکاروں کی تنخواہیں روک دیں۔ شمال میں رہنے والوں کی اکثریت کو شدید مفلسی کا سامنا ہے، اسکول اور اسپتال بھی بند ہیں۔

سنی ممالک کی قیادت کرنے والے سعودی عرب کو یمن میں دہری شکست کا سامنا ہے، ایک تو وہ منصور ہادی کی حکومت بحال کرانے میں ناکام رہا، دوسرا یمن جنگ کے ذریعے ایران کی شیعہ حکومت کو پیغام دینے میں بھی ناکامی کا سامنا رہا۔ سعودی عرب اور ایران خطے میں اپنی برتری قائم کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ دونوں طاقتوں کی جنگ شام، لبنان اور عراق میں انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ سعودیہ کو خدشہ ہے کہ حوثیوں کی شکل میں ایران حزب اللہ کی طرح کی ایک اور شیعہ ''پراکسی'' کی پرورش کررہا ہے۔ یمن اب بڑی طاقتوں کا میدان جنگ بن چکا ہے۔ امریکا کا کہنا ہے کہ ایران نے حوثیوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش نہیں کی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایران حوثیوں کو اسلحہ فراہم کررہا ہے، جس کا ثبوت حوثیوں کی جانب سے میزائل حملوں کی صورت میں موجود ہے۔ ستمبر میں خطے میں موجود سینئر ترین امریکی ایڈمرل نے نیویارک ٹائمز کو بتایا ''ایران نے اینٹی شپ اور بیلسٹک میزائل، مائنز اور جنگی کشتیاں یمن میں موجود باغیوں کو فراہم کی ہیں، جن کو وہ بحیرہ احمر میں اتحادیوں پر حملے کے لیے استعمال بھی کررہے ہیں۔ ۴ نومبر کو یمن سے ریاض کی جانب داغے گئے میزائل کو گرانے کے بعد سعودی عرب نے اسے ایرانی جارحیت قرار دیا تھا۔

جنگ جلد ختم ہونے کے امکانات بہت کم ہیں، جنگ جاری رکھنے کے لیے سعودی عرب کے پاس کافی طاقت ہے۔ صدر ٹرمپ سعودیوں کی حوصلہ افزائی کے علاوہ کچھ نہیں کررہے۔ اپنے ریاض کے دورے کے دوران ٹرمپ نے حوثیوں کے خلاف سخت کارروائی کی تعریف کی اور ۱۱۰ ارب ڈالر کا اسلحہ سعودی عرب کو فراہم کرنے پر بھی اتفاق کیا۔ یہ جنگ برطانوی دفاعی صنعت کے لیے بھی ایک نعمت ہے، جس نے جنگ کے آغاز کے بعد سے سعودی عرب کو میزائل اور بموں کی فروخت میں بہت زیادہ اضافہ کردیا ہے۔ ۲۰۱۶ء میں یورپی پارلیمان نے جب سعودی عرب کو ہتھیار فروخت کرنے پر پابندی لگائی تو وزیراعظم کیمرون نے سعودی عرب کو فراہم کیے جانے والے برطانوی ہتھیاروں کی تعریف کی، ان کی جگہ لینے والی وزیراعظم

تھریسا مے نے کم از کم جنگ پر اپنی تشویش کا اظہار تو کیا ہے۔ امریکا اور برطانیہ صرف سعودی عرب کی حمایت ہی نہیں کر رہے بلکہ انہوں نے دیگر ممالک کو بھی سعودی عرب پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے سے روک دیا ہے۔ فرانس بھی سعودی عرب کو اسلحہ فروخت کرتا ہے، فرانس نے بھی ۲۰۱۵ء میں جنگی جرائم کی تحقیقات کے لیے پینل تشکیل دینے کی اقوام متحدہ کی قرارداد کو بے اثر کر دیا تھا۔ اس سال کے آغاز میں فرانس نے نیا پینل تشکیل دینے پر زور دیا ہے، اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے کمشنر زید نے بین الاقوامی برادری کی جانب سے جنگ کے متاثرین کے لیے انصاف کا مطالبہ نہ کرنے کی مذمت کی ہے، پینل کی منظوری دے دی گئی تھی، مگر امریکا، برطانیہ اور فرانس نے مل کر اسے ناکام بنا دیا۔ اقوام متحدہ امن مذاکرات کے تین دور منعقد کرا چکا ہے، مگر منصور ہادی حکومت کا اصرار ہے کہ حوثی ہتھیار ڈال دیں اور اپنے زیر قبضہ علاقوں کو خالی کر دیں، حوثیوں کو شکایت ہے کہ اقوام متحدہ کی قرارداد میں صرف ان سے زمین خالی کرنے کا کہا گیا ہے۔ مئی میں اقوام متحدہ کے سفیر اسماعیل احمد کے قافلے پر صنعا میں مظاہرین کی جانب سے حملہ کیا گیا، اس حملے کے ایک ماہ بعد حوثی رہنما صالح الصمد کا کہنا تھا "ہمارا اسماعیل سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور انہیں یہاں خوش آمدید نہیں کہا جائے گا"۔ جنگ نے دونوں کو غیر مستحکم کر دیا ہے، جنوب میں سعودی عرب اور امارات زمین پر موجود سب بڑی غیر ملکی طاقت ہیں، انہوں نے علیحدگی پسندوں اور مختلف ملیشیا پر مشتمل ایک سلفی اتحاد بنایا ہے، جس کو کنٹرول کرنا ناممکن ہے، ایک مبصر کا کہنا ہے کہ "خلیج کے پیسے سے کچھ بھی خریدا جا سکتا ہے"، سلفی اتحاد میں شامل کچھ گروہوں پر جزیرہ عرب میں القاعدہ کے ساتھ کام کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ شمال میں موجود حوثیوں نے صالح پر سعودی اتحاد سے خفیہ مذاکرات کرنے کا الزام لگایا ہے (اگرچہ حوثی خود بھی یہ کام کر چکے ہیں) صالح اس تنازعے کے کمزور فریق ہیں، صالح کو خوف ہے کہ کوئی معاہدہ انہیں باہر رکھ کر نہ کر لیا جائے، اسی تناظر میں اگست میں حالات کافی خراب ہوئے تھے، جب حوثیوں اور صالح کے حامیوں کے درمیان لڑائی میں دونوں جانب کے لوگ مارے گئے، جس کے بعد دونوں جانب سے حالات ٹھیک رہے مگر کشیدگی میں پھر اضافہ ہو گیا ہے۔ حوثی انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں میں تقسیم ہو گئے ہیں، حوثیوں کے قائد عبدالملک مذاکرات کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ ایک مبصر کا کہنا ہے کہ "جنگ جتنی طویل ہوگی، انتہا پسند اتنے ہی مضبوط ہوں گے"۔ اسماعیلی نے تنازعے کا تجزیہ کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ "سمجھوتے کے لیے تیار افراد کو کچھ تو دینا ہوگا، ابھی صرف لاٹھی کا استعمال جاری ہے" اب سعودی عرب پر کچھ بیرونی دباؤ بھی ہے، مگر وہ پیچھے ہٹتے نظر نہیں آتے۔ انہیں امید ہے کہ شمال میں لوگ حوثیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے، حوثیوں کی حکومت سے لوگوں کی مایوسی بڑھتی جا رہی ہے۔ کچھ چیزوں کو صالح بھی بڑھاوا دے رہے ہیں، مگر زیادہ تر سڑکوں پر خاموشی چھائی ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو امن نہیں چاہتے، وار لارڈز کو بھتے اور امدادی سامان کی لوٹ مار سے کافی پیسے ملتے ہیں، ہادی حکومت اور لڑنے والے دیگر گروپس پر الزام ہے کہ وہ مصنوعی قلت پیدا کرتے ہیں تاکہ اپنے پاس موجود اشیا فروخت کر سکیں، جیسا کہ پیٹرول بھاری منافع پر فروخت کیا جاتا ہے۔ بہت سے مبصرین کی نظر میں اگر سعودی جنگ ختم کر دیں تو بھی یمن میں جنگ جاری رہے گی، شمال اور جنوب کے درمیان، اسی طرح حوثیوں، صالح، اصلاح اور دیگر گروپس کے درمیان۔ عام یمنی شہری تقسیم میں کم ہی دلچسپی رکھتا ہے، علی مرحاد کے خیمے کے گرد لوگوں کی کافی بھیڑ جمع تھی، جو اپنی مشکلات بیان کرنا چاہتے تھے، یہ لوگ حوثیوں کے زیر قبضہ علاقوں سے آئے تھے، کہتے تھے کہ ان کے پاس کوئی قبیلہ، گھر اور پیسہ نہیں، مگر صرف اللہ ہے۔ کیا ان تباہ حال لوگوں کو اس بات کی پروا ہے کہ جنگ کون جیتے گا؟؟ ہرگز نہیں، وہ لوگ ظلم کا شکار ہیں، اور بس جنگ کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ (ترجمہ: سیدطالوت اختر)

(نوٹ: اس کالم کی اشاعت کے چند روز بعد علی عبداللہ صالح کو مار دیا گیا تھا)

"The new Gulf war: How Yemen became the most wretched place on earth".
("The Economist". Nov. 30, 2017)

مکتی باہنی کی یادگار: پارک کا افتتاح

ہندوستان کی بنگلا دیش سے متصل ریاست تری پورہ کے وزیر اعلیٰ نے ۱۹۷۱ کی جنگ میں مارے جانے والے بھارتی فوجیوں اور بنگلا دیشی جنگجوؤں کے یادگار ایک پارک کا افتتاح کیا ہے۔ ۲۰ ہیکٹر پر پھیلے اس پارک میں ۷ چھوٹی پہاڑیاں اور ایک جھیل موجود ہے۔ اس پارک کا سنگِ بنیاد بنگلا دیشی وزیر خارجہ دیپو مونی نے نومبر ۲۰۱۰ میں رکھا تھا۔ پارک کے افتتاح کے موقع پر وزیر اعلیٰ کا کہنا تھا کہ یہ پارک تری پورہ اور بنگلا دیش کی دوستی کی علامت ہے۔

تری پورہ کے وزیر بادل چودھری کا کہنا تھا کہ وہ بنگلا دیش کے ساتھ معاشی تعاون کو مزید مستحکم کرنا چاہتے ہیں اور چٹاگانگ کی بندرگاہ کے استعمال کے بھی خواہاں ہیں۔

پارک میں ایک مخصوص جگہ پر شیخ مجیب الرحمٰن اور اندرا گاندھی کے مجسمے نصب کیے گئے ہیں، یہ جگہ ماضی میں مکتی باہنی کے جنگجوؤں کا اڈہ رہی ہے، جہاں سے وہ ضلع کومِلہ کے علاقوں میں پاکستانی فوج کے خلاف کارروائیاں کرتے تھے۔

پارک میں ایک عجائب گھر بھی زیرِ تعمیر ہے، جہاں بنگلا دیش کی جنگ سے متعلق ہتھیار اور تصاویر کی نمائش کی جائے گی۔ سابق ڈپٹی اسپیکر اور حکمران جماعت کے راہنما سبل ردرا کا کہنا تھا کہ جنگ کے دوران وہ مکتی باہنی میں شامل ہوئے اور مختصر تربیت کے بعد کومِلہ سیکٹر میں پاکستانی فوج کے خلاف لڑے۔ اس پارک کا نام "بنگلا دیش - بھارت دوستی پارک" رکھا گیا ہے اور امید کی جا رہی ہے کہ یہ پارک دونوں ملکوں کے سیّاحوں کی توجہ کا مرکز بنے گا۔

| | |

سقوط بنگلا دیش: بنگلا دیش کی حکومت کا ۲۵ مارچ کو 'یوم قتل عام' کے طور پر تسلیم کرنے پر اصرار

اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ پاکستان کی فوج کی جانب سے ۱۹۷۱ء میں بنگلا دیش کے باشندوں کے قتل عام کے حوالے سے ۲۵ مارچ کو 'یوم قتل عام' کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ یہ مطالبہ سقوطِ بنگلا دیش کے موضوع پر ایک سیمینار میں کیا گیا۔ مزید یہ کہا گیا کہ بنگلا دیش کے افراد کا یہ قتل عام جان بوجھ کر اور منصوبہ بندی کے تحت کیا گیا تھا۔ اسرائیل پالیسی فورم کے امریکی نژاد تھامس ڈائن نے کہا ہے کہ جس روز یہ قتل عام ہوا اس وقت میں دہلی میں تعینات تھا اور میری بنیادی جبلت نے مجھے بتایا کہ یہ سب کچھ منصوبہ بندی کے تحت کیا گیا ہے۔ ڈائن نے دعویٰ کیا ہے کہ امریکا کے صدر رچرڈ نکسن اور اس کے مشیر ہنری کیسنجر کے خلاف مقدمہ چلایا جائے کیوں ان دونوں نے اس قتل عام کی حمایت کی تھی۔ جنتا کمار رے نے دعویٰ کیا ہے امریکا نے ڈیڑھ بلین ڈالر کی خطیر رقم پاکستان کو دی کہ وہ قتل عام کرے۔

بنگلا دیشی صحافی، فلم ساز اور انسانی حقوق کے علم بردار شہریار کبیر نے کہا ہے کہ بنگلا دیش کی حکومت نے اقوام متحدہ کو یقین دلانے کے لیے تمام ضروری اقدامات اٹھائے ہیں کہ ۲۵ مارچ کو 'یوم قتل عام' کے طور پر منظور کرے۔ بھارتی بریگیڈیئر آر پی سنگھ نے کہا ہے کہ جنگ آج بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ جنگ اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک پاکستان کے ۱۹۴ فوجی اور ان کے حامیان کو سزا نہیں دی جائے گی۔

| | |

ٹرمپ کا دورِ صدارت: امریکی کردار

Hal Brands

ڈونلڈ ٹرمپ نے جب سے امریکی صدر کا منصب سنبھالا ہے تب سے وہ ایسا بہت کچھ کر رہے ہیں جو امریکا کو ایک عظیم طاقت بنانے والے عوامل کے خلاف ہے۔ انہوں نے قدم قدم پر ایسی باتیں اور حرکتیں کی ہیں جو ان کے منصب کے تقاضوں سے کسی بھی طور میل نہیں کھاتیں۔ ان کی کوشش رہی ہے کہ جو کھلنڈرا پن ان کے مزاج میں پایا جاتا ہے وہ امریکی صدر کے منصب میں بھی دکھائی دے۔ امریکا کو ایک عظیم طاقت میں تبدیل کرنے والے اصولوں، طریقوں اور خواص کو انہوں نے نشانے پر لینے کی کوشش کی ہے اور یہ بات اب بیشتر امریکی زیادہ شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

عالمی سیاست کے حوالے سے کوئی بھی پیش گوئی انتہائی دشوار کام ہے۔ حالات اتنی تیزی سے بدلتے ہیں کہ ہر پیش گوئی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اور ٹرمپ کا معاملہ تو اور بھی پیچیدہ ہے۔ انہوں نے ایک سال کے دوران ایسا بہت کچھ کیا ہے جس کی بنیاد پر ان کے بارے میں پورے یقین سے کچھ کہنا انتہائی دشوار ہو چکا ہے۔ پیش گوئی کرنے والوں کو بھی اندازہ ہے کہ وہ اگر کچھ کہیں گے تو ٹرمپ اس کے خلاف کچھ نہ کچھ کر کے انہیں ناکامی و ذلت سے دوچار کریں گے۔ یہ بات البتہ پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ مورخین جب ڈونلڈ ٹرمپ کے ادوار کے بارے میں لکھیں گے تو اس نکتے پر ضرور زور دیں گے کہ انہوں نے اپنے کھلنڈرے مزاج سے وہ نظم و ضبط تباہ کر دیا جو امریکی صدر کے لیے لازم قرار دیا جاتا تھا۔ اب تک انہوں نے بہت کچھ rand om کے اصول کی بنیاد پر کیا ہے، جس کے نتیجے میں امریکا کو کئی معاملات میں تھوڑی بہت سبکی کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہ بات سب کو محسوس ہونے لگی ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کے پاس اپنا کوئی وژن نہیں۔ وہ کوئی ایسی ''گرینڈ اسٹریٹیجی'' تیار کرنے میں اب تک کامیاب نہیں ہو سکے جس کی بنیاد پر کہا جاسکے کہ وہ امریکی معاشرے اور قیادت کے ڈھانچے کو کوئی باضابطہ نئی شکل دینا اور بحرانوں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی سنجیدگی کا گراف خاصا نیچا ہے۔

کسی بھی ملک کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کی کوئی واضح اور بڑی حکمت عملی نہ ہو۔ اس مرحلے سے گزرے بغیر کوئی بھی ریاست ترقی تو کیا کرے گی، اپنا وجود بھی برقرار نہ رکھ پائے گی۔ امریکا کوئی عام ملک نہیں، عالمی طاقت ہے۔ اس کے لیے تو قیادت کے ڈھانچے کا مضبوط ہونا اور بیشتر بین الاقوامی معاملات میں واضح حکمت عملی کا ہونا لازم ہے۔ امریکا میں ایک زمانے سے عظیم، ہمہ گیر حکمت عملی اپنانے کا رجحان رہا ہے۔ اور یہ رجحان محض اپنی پسند کا نہیں بلکہ مجبوری ہے اور لازم ہے۔ امریکا سپر پاور ہے۔ اسے کئی ممالک سے خصوصی تعلقات استوار رکھنا پڑتے ہیں۔ ہر خطے پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔ کسی بھی صدر کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ملک کی ''گرینڈ اسٹریٹیجی'' سے ہٹ کر کچھ کرے۔ وہ اگر نمایاں حد تک بصیرت سے محروم ہو اور مستقبلِ بعید کے بارے میں سوچنے اور اس حوالے سے کوئی واضح منصوبہ تیار کرنے کا اہل نہ ہو تب بھی اسے حکمت عملی کے حوالے سے بہت سے معاملات میں غیر معمولی دلچسپی لینا ہی پڑتی ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ بظاہر بصیرت کے حامل نہیں۔ مگر ان کے لیے بھی ممکن نہیں کہ ملک کی گرینڈ اسٹریٹیجی کو نظر انداز کریں یا اس سے مطابقت رکھنے والے اقدامات نہ کریں۔ لیون ٹراٹسکی نے خوب کہا ہے کہ اگر کوئی صدر گرینڈ اسٹریٹیجی میں زیادہ دلچسپی نہ لیتا ہو تب بھی گرینڈ اسٹریٹیجی تو اس میں دلچسپی لیتی ہی ہے۔ یعنی پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں، صرف بڑھنے کا آپشن ہے۔

یہ نکتہ کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ڈونلڈ ٹرمپ نے ایک اہم موقع پر امریکا کی صدارت سنبھالی ہے۔ ان کے انتخاب سے پہلے کے ۷۰ برسوں میں امریکا نے دوسری عالمی جنگ عظیم کے بعد سے ایک ایسی طاقت کا کردار ادا کیا تھا جو پوری دنیا کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا بھرپور عزم اور توانائی رکھتی تھی۔ امریکا نے کئی خطوں کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کیا۔ متعدد ممالک کو تعمیر و ترقی کی نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ اور دوسری طرف کئی ممالک امریکا کے ہاتھوں خرابیوں سے بھی دوچار ہوئے۔ ۱۹۹۰ء میں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا چونکہ واحد سپر پاور تھا اس لیے اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں۔ تقریباً تین عشروں پر محیط اس مدت کے دوران امریکا نے اچھا کم اور بُرا زیادہ کیا ہے۔ بعض مواقع پر صاف محسوس کیا گیا کہ امریکا کے لیے معاملات الجھے ہوئے ہیں اور وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے اس کی پشت پر یا تو بدحواسی ہے یا پھر خوف۔ یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ڈونلڈ ٹرمپ ایک ایسے وقت امریکا کے صدر منتخب ہوئے ہیں کہ جب چین اپنی پوری قوت کے ساتھ ابھر کر سامنے آچکا ہے۔ چین ایک بڑا چیلنج ہے جس سے نمٹنے کے لیے امریکا کو اپنی ''گرینڈ اسٹریٹیجی'' تبدیل کرنا پڑے گی۔ ایک طرف چین نے امریکا کی عسکری و معاشی بالادستی کے لیے بہت بڑے چیلنج کی حیثیت اختیار کی ہے اور دوسری طرف مشرق وسطیٰ میں بھی صورتِ حال بہت تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے جو امریکا کے لیے مشکلات پیدا کر رہی ہے۔ یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ دنیا بھر میں جمہوریت کو بہتر طرزِ حکمرانی کی حیثیت سے قبول نہ کرنے کا رجحان پروان چڑھ رہا ہے۔ عام آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ اگر آمریت اس کے مسائل حل کر دے تو جمہوریت کی کیا ضرورت ہے؟

کئی عشروں سے امریکا عالمی سیاست و معیشت پر بلاشرکتِ غیرے متصرّف رہا ہے۔ اس نے یورپ کو ساتھ ملا کر اپنی مرضی کے فیصلے کیے ہیں اور ان فیصلوں کا پھل بھی کھایا ہے۔ مگر اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ کئی ممالک تیزی سے مضبوط ہو کر ابھرے ہیں۔ یورپ نے اپنی راہ بہت حد تک الگ کر لی ہے۔ چین، روس، بھارت، برازیل، جنوبی افریقا اور دوسرے بہت سے ممالک تیزی سے مستحکم ہوئے ہیں۔ ان کا استحکام امریکی بالادستی کے لیے واضح خطرے کی شکل میں ابھرا ہے۔ یہ سوال امریکا میں بھی جڑ پکڑ چکا ہے کہ عالمی سیاست و معیشت میں اب امریکا کے لیے کیا رہ گیا ہے۔ گزشتہ صدارتی انتخاب میں جہاں دیدہ سیاست دان ہلیری کلنٹن شکست سے دوچار ہوئیں، اگر وہ صدر منتخب ہوئی ہوتیں تو ان کے سامنے بھی سب سے اہم سوال یہ ہوتا کہ عالمی سطح پر امریکا کو برتر حیثیت برقرار رکھنے کے قابل کس طور بنایا جائے۔ سیدھی سی بات ہے، چیلنجز بڑھ چکے ہیں۔ حکمت عملی میں غیر معمولی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے اب تک ایسا کچھ نہیں کیا ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکے کہ وہ امریکا کو نئی بلندیوں پر لے جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ بظاہر اس سیاسی بصیرت سے محروم دکھائی دیتے ہیں جو کسی امریکی صدر کے لیے لازم سمجھی جاتی ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ وہ اپنی شخصیت کا کوئی تاثر چھوڑنے میں مکمل ناکام رہے ہیں۔ چند ایک معاملات میں انہوں نے بڑھک سے ہٹ کر عمل کے میدان میں اعتدال پسندی کا ثبوت دیا ہے مگر مجموعی طور پر وہ اپنے اقوال و اعمال سے امریکی فکر کو متاثر کرنے میں تھوڑے بہت

کامیاب ضرور ہوئے ہیں۔ یہ بات محسوس کی جارہی ہے کہ امریکا نے جن اصولوں اور طریق کار کو اپنا کر اب تک عالمی سیاست ومعیشت میں اپنی بالادستی کسی نہ کسی طور برقرار رکھی ہے اُنہیں ٹرمپ نے متاثر کرنے کی کوشش کی ہے اور کسی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ٹرمپ کا دعوٰی ہے کہ جو کچھ وہ سوچتے اور کرتے ہیں اس سے امریکا کی طاقت اور دولت میں غیر معمولی اضافہ ہوگا اور عالمی سیاست ومعیشت میں امریکی بالا دستی برقرار رہے گی،مگر درحقیقت ان کی پالیسیوں سے امریکا کو نقصان پہنچ رہا ہے۔پالیسی ساز اب یہ بات شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ ٹرمپ کے آنے کے بعد سے امریکا کی سب سے بڑی طاقت والی حیثیت متاثر ہوئی ہے۔ جو کچھ وہ کہتے رہے ہیں اُس کے وہ اثرات رونما نہیں ہوئے ہیں جو ہونے چاہیے تھے۔امریکیوں کو اچھی طرح اندازہ ہو چکا ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کی پالیسیوں سے عالمی سطح پر امریکا کی پوزیشن قابل ذکر حد تک متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

امریکی بالادستی کا منبع

امریکا نے چار نسلوں تک دنیا کو ایک ایسا نظام دیا ہے جس نے امن،خوش حالی،استحکام اور جمہوریت کی راہ ہموار کی ہے۔ یہ بات دیگر نظام ہائے سیاست سے موازنے کی صورت میں کہی جارہی ہے۔ امریکا نے عالمی سیاست و معیشت پر جو بالادستی پائی وہ اس کی ''سخت قوت'' کا نتیجہ تھی۔ امریکا کے پاس بے مثال قوت تھی اور اس قوت کو بھرپور انداز سے بروئے لانے پر بھی خاطر خواہ توجہ دی گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکا نے باضابطہ عالمی طاقت کی حیثیت اختیار کی۔سرد جنگ کے زمانے میں بھی اس کا ثانی کوئی نہ تھا۔سابق سوویت یونین کے ہوتے ہوئے بھی امریکا کی عالمی حیثیت اتنی مضبوط تھی جسے چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ امریکا نے غیر معمولی عسکری قوت کے ذریعے پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں رکھا۔سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا کی عسکری قوت مزید بڑھ گئی۔ عالمی معیشت میں بھی اس کا حصہ اس قدر بڑھ گیا کہ ایک مرحلے پر امریکی خام قومی پیداوار عالمی خام قومی پیداوار کا پچیس فیصد تھی۔ دنیا نے کسی ایک ملک کو باقی دنیا کے مقابلے میں اس قدر طاقتور کبھی نہیں دیکھا۔

چند برسوں کے دوران امریکی بالادستی کے لیے بہت سے خطرات پیدا ہوئے ہیں۔ چین،روس اور دیگر ممالک ابھر کر سامنے آئے ہیں مگر اس کے باوجود امریکا کی عسکری اور معاشی قوت اب بھی اس قدر ہے کہ وہ عالمی سیاست ومعیشت پر نمایاں حد تک متصرّف ہے۔امریکی قیادت اب بھی دنیا بھر میں معاملات کو الٹنے اور پلٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر امریکا چاہتا تو ایسی حکمت عملی ترتیب دے سکتا تھا جو صرف اس کے لیے کارگر ہوتی اور اسے زیادہ سے زیادہ عسکری و معاشی قوت سے ہمکنار کرتی مگر پالیسی سازوں نے ایک ایسا بین الاقوامی نظام ترتیب دینے پر توجہ دی جس کے ذریعے صرف امریکا بھرپور استحکام سے ہمکنار نہ ہو بلکہ مجموعی طور پر تمام خطے ترقی کریں، خوش حالی پائیں۔ اور خاص طور پر ہم خیال ممالک زیادہ مستفید ہوں۔اس بین الاقوامی نظام کو چلانے کے لیے ادارے معرض وجود میں لائے گئے، پروگرامز ترتیب دیے گئے۔ یوں اب تک بین الاقوامی نظام کے معاملے میں امریکا عالمی راہنما کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ امریکا نے عسکری اتحاد تشکیل دیے۔کوشش کی گئی کہ بین الاقوامی تجارتی راستوں کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنایا جائے۔یہ سب کچھ عالمی سطح پر امن برقرار رکھنے کی خاطر کیا گیا،مگر درحقیقت امریکا یہ چاہتا تھا کہ ایک ایسی دنیا تشکیل دی جائے جس میں وہ خود زیادہ آسانی سے ترقی واستحکام سے ہمکنار رہ سکے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کی امریکی مساعی درحقیقت صرف اس مقصد کے تحت تھیں کہ عالمی سیاست ومعیشت میں اس کی بالادستی قائم ہو اور برقرار رہے۔امریکا نے عالمی نظام پر اس قدر زور دیا ہے تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ معیشت،عسکری قوت اور سفارت کاری کے میدان میں اپنی پوزیشن زیادہ سے زیادہ مستحکم رکھنا چاہتا ہے۔اس نے جو دنیا تشکیل دی اس سے بھرپور استفادہ بھی کیا ہے۔عالمی معیشت کو اپنی مرضی کے مطابق چلا کر امریکا نے اپنی طاقت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔

ہر حال میں سب سے پہلے امریکا کا نعرہ امریکی سیاست ومعیشت کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔امریکا نے کبھی اپنے مفادات کو کسی بھی صورتِ حال کے تابع نہیں کیا۔ وہ صورتِ حال کو اپنے مفادات کے تابع کرنے پر یقین رکھتا آیا ہے۔ ایک یورپی سفارت کار کا کہنا ہے کہ یورپ نے ستر سال تک امریکا کی ڈفلی پر رقص کیا ہے۔ویتنام سے نکارا گوا تک لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ اپنے ملک کے مفادات کو ہر حال میں تقویت بہم پہنچانے کے لیے امریکی حکام نے غیر معمولی تشدد اور ظلم وجبر کی راہ پر چلنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔

یہ نکتہ نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ امریکا نے عالمی سیاست ومعیشت میں اب تک جو بھی مرضی کے فیصلے کیے ہیں ان کے حوالے سے زیادہ طاقت استعمال نہیں کی۔وہ اگر چاہتا تو اپنی طاقت کے ذریعے غیر معمولی حد تک اپنی مرضی کے فیصلے کرسکتا تھا مگر اس کے بجائے کم استحصالی انداز اختیار کر کے امریکا نے ان تمام ممالک کا بھی بھلا سوچا جو عالمی نظام کے حوالے سے اس کے تصورات کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ دیگر سپر پاورز کے مقابلے میں امریکا نے طاقت کے ذریعے بات منوانے پر کم توجہ دی۔امریکا کے بہت سے شراکت دار اس امر کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ کسی بھی معاملے میں امریکا کی بالادستی سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں امریکا معاملات سے الگ تھلگ نہ ہو جائے!

معیشت اور سیاست سے ہٹ کر بھی کئی معاملات میں امریکی اندازِ قیادت بہت اہم رہا ہے۔دوسری جنگ عظیم کے بعد سے امریکا نے عالمی سطح پر امن اور استحکام کے حوالے سے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔امریکی قیادت نے ثابت کیا ہے کہ وہ عسکری امور میں کمٹ منٹ کے مطابق کام کرنے اور ڈلیور کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔اور یہ کہ ایک انتہائی خطرناک دنیا میں حقیقی استحکام پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کی صلاحیت اگر کسی میں پائی جاتی ہے تو وہ امریکا ہے۔

امریکی صدور اس امر کے لیے کوشاں رہے ہیں کہ دنیا بھر جمہوریت اور بنیادی حقوق کی پاسداری یقینی بنائی جائے۔امریکی قیادت یہ سمجھتی ہے کہ عالمی سطح پر بالادستی برقرار رکھنے میں یہ بات بھی کلیدی حیثیت رکھتی ہے کہ اخلاقی سطح پر امریکا کیسی دنیا دیکھنا

آراء قارئین

جناب مدیر'' معارف فیچر''

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

'' معارف فیچر'' اور اس کے فکر انگیز متدرجات پر آپ کو ہدیہ تبرک پیش کرتا ہوں۔ سیاست کے میدان میں کام کرنے والوں کے لیے خصوصاً اور مسلم اُمہ کے احوال پر سوچنے والوں کے لئے عموماً '' معارف فیچر'' کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔کیا ہی اچھا ہو کہ ہم اپنے ذمہ دار لوگوں کو ''معارف فیچر'' کا مطالعہ اور اس کے مندرجات پر غور وفکر کے لیے اسٹڈی سرکل کی درخواست کریں۔اس وقت تو مجھے یقین ہے کہ ہمارا کوئی ذمہ دار ''معارف فیچر'' کا مطالعہ نہیں کرتا ہوگا۔

والسلام

پروفیسر ملک محمد حسین جوہر آباد

چاہتا ہے۔ امریکا نے اپنی اخلاقی بالادستی بھی یقینی بنانے کے لیے دنیا بھر میں کھلے معاشرے معرض وجود میں لانے اور لبرل ازم کو بھرپور تقویت بہم پہنچانے کی کوششیں جاری رکھی ہیں۔

سابق امریکی وزیر خارجہ جارج شلز نے ایک بار کہا تھا کہ امریکا نے زیادہ مستحکم تعلقات ان ممالک سے استوار رکھے ہیں جہاں جمہوریت کی جڑیں گہری اور مضبوط ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں۔ امریکا جن ممالک میں حقیقی جمہوریت اور لبرل روایات دیکھنا چاہتا ہے ان کی طرف زیادہ جھکتا ہے۔ امریکی قیادت انہی ممالک سے بہتر سیاسی اور معاشی روابط کو فروغ دینے پر آمادگی ظاہر کرتی ہے جہاں کی سیاسی روایات امریکی سیاسی روایات سے ہم آہنگ ہوں۔ معاملات محض لین دین کی سطح سے کہیں بلند ہو کر حقیقی نظریاتی اور ثقافتی ہم آہنگی تک بھی جاتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ امریکا نے صرف ''سخت قوت'' (معاشی و عسکری) پر مدار رکھا ہے۔ وہ اپنی بات منوانے کے لیے اور اپنی نمبر ون پوزیشن برقرار رکھنے کے لیے دنیا بھر میں سوفٹ امیج بھی پھیلاتا ہے۔ امریکیوں نے ہر دور میں چاہا ہے کہ دنیا ان کے ملک کو دیکھ کر صرف خوفزدہ نہ ہو بلکہ متاثر ہو کر متوجہ بھی ہو۔ آج دنیا بھر میں امریکا کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود دنیا کے ہر ملک کے باشندے چاہتے ہیں کہ انہیں کسی نہ کسی طور امریکا میں داخل ہونے کا موقع مل جائے۔ جن ممالک سے امریکا کے تعلقات اچھے نہیں اور جہاں کے لوگ امریکا سے شدید نفرت کرتے ہیں وہاں بھی لوگ اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ امریکی ویزا لگ جائے۔ یعنی مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ امریکا کی ''سخت قوت'' کو تقویت بہم پہنچانے میں ''نرم قوت'' نے بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ناپسندیدہ ہوتے ہوئے بھی امریکا میں دنیا بھر کے لوگوں کے لیے غیر معمولی کشش پائی جاتی ہے۔

روایت، اکھاڑ پچھاڑ اور ڈونلڈ ٹرمپ

اب تک ڈونلڈ ٹرمپ نے جو کچھ کہا ہے وہ اس امر کا غماز ہے کہ وہ بنانے پر کم اور بگاڑنے پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ (ڈین ایچیسن کے لیے یہ بات بہت اہم تھی کہ وہ امریکا کی تخلیق کے وقت تھے)۔ ڈونلڈ ٹرمپ کی بڑھکیں دیکھتے ہوئے یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ انہیں شاید کل کو یہ بات قابل فخر محسوس ہو کہ وہ امریکا کی تباہی کے وقت موجود تھے۔ ٹرمپ نے اپنی انتخابی مہم کے دوران ایسا بہت کچھ کہا جو بتاتا ہے کہ انہیں بنیادی امریکی اقدار کی پاسداری کا ذرا بھی خیال نہیں۔ انہوں نے آزاد تجارت کے بجائے اپنے مفادات کو ہر حال میں مقدم رکھنے کی تجارت پر زور دیا۔ ٹرمپ نے جمہوریت کے لیے اب تک ویسی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا جیسی ان کے پیش رَو بیان کرتے آئے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے جمہوریت کے مقابل ولادیمیر پوٹن کے لیے پسندیدگی کا اظہار کیا جو مطلق العنانیت کو بنیادی سیاسی قدر قرار دے کر تمام اختیارات اپنی ذات میں سمیٹنا چاہتے ہیں۔ امریکا نے پانچ چھ عشروں میں جو کچھ بھی پایا ہے اُسے ٹرمپ ٹھکانے لگانا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ امریکا نے جنگ کے بعد کے زمانے میں جو خارجہ پالیسی اپنائی وہ بہت سے معاملات میں مخالفین کو اس قدر رعایتیں دیتی رہی ہیں کہ اب وہ منہ دینے کا سوچ رہے ہیں۔ امریکا نے دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا میں عالمی معیشت کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش ضرور کی ہے مگر اس کوشش میں اس نے اپنی مصنوعات اور ٹیکنالوجی دنیا بھر کو دی ہے۔ اس بات کو ٹرمپ جیسے لوگ پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ امریکا کو اپنی ٹیکنالوجیز اور جدید ترین مصنوعات ساری دنیا میں پھیلانے سے گریز کرنا چاہیے۔

ٹرمپ نے امریکی فوج کو قیدیوں پر تشدد ڈھانے کی اجازت دیتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ دہشت گردی ختم کرنے کی خاطر اگر جنگی جرائم کا ارتکاب بھی کرنا پڑے تو ایسا کرنے میں کچھ ہرج نہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکا نے کسی نہ کسی طور اپنی بالادستی کو برقرار رکھا ہے مگر ٹرمپ اُسے ٹھکانے لگانے کے لیے بے تاب ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جو کچھ ٹرمپ نے صدر کی حیثیت سے کہا ہے وہ جذباتیت کی طرح پر ہے۔ وہ ایک زمانے سے کئی امریکی شراکت داروں پر شدید نکتہ چینی کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۰ء کے عشرے میں جاپان اور کویت کو شدید نکتہ چینی کا نشانہ بناتے ہوئے کہا تھا کہ ان دونوں ممالک سے امریکا کو ملا کم ہے اور امریکا نے دیا زیادہ ہے۔ اسی طور انہوں نے ۲۰۱۵ء اور ۲۰۱۶ء میں جرمنی اور میکسیکو پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ ان دونوں ممالک نے امریکا کے لیے طفیلی کا کردار ادا کیا ہے۔ اپنی انتخابی مہم کے دوران انہوں نے امریکا کے بعض شراکت داروں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ ان کے دو ڈھائی عشروں کے خیالات ہی کا عکاس تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹرمپ نے صدر کی حیثیت سے امریکا کے بعض اتحادیوں اور اتحادیوں کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ محض بڑھک نہیں، جذباتیت کی سطح پر نہیں بلکہ وہ واقعی کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی وہ امریکا کے بعض اتحادیوں کو ایک طرف ہٹانے اور نئے تعلقات استوار کرنے کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے بے تاب ہیں۔

(۔۔۔جاری ہے!)

"The unexceptional superpower: American grand strategy in the age of Trump". ("iiss.org". November 20, 2017)

آپ کی توجہ مطلوب ہے!

۱۔ گزارش ہے کہ جب آپ کا پتا تبدیل ہو جائے تو براہِ کرم ہمیں اس کی تحریری اطلاع مع نیا پتا بلا تاخیر بھیج دیا کریں، تاکہ پچھلے پتے پر جا کر پرچہ ضائع نہ ہو۔ اگر ہمارا لکھا ہوا پتا ادھورا یا غلط نظر آئے تو تصحیح میں ہماری مدد فرمائیں۔

۲۔ کسی صاحب کو ''معارف فیچر'' ان کی خواہش کے بغیر جاری ہو گیا ہو یا اب اِسے لینا پسند نہ ہو تو گزارش ہے کہ براہِ کرم ہمیں اس کی اطلاع دینے کی زحمت ضرور کریں تاکہ پرچے کی ترسیل بند کی جاسکے۔

۳۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ''معارف فیچر'' جاری ہو جانے کے بعد از خود بند نہیں کیا جاتا۔ اگر آپ میں سے کسی صاحب/صاحبہ کو پرچہ بذریعہ ڈاک ایک بار بھی ملا ہو تو انہیں سمجھنا چاہیے کہ بعد میں بھی ان شاء اللہ ملتا رہے گا، تاآنکہ وہ خود منع کر دیں۔ اگر پرچہ ملنا رُک گیا ہو تو اس کا سبب ترسیل کا بند ہونا نہیں، کچھ اور ہو سکتا ہے۔ مثلاً ڈاک والوں کی مہربانی یا پتا تبدیل ہو جانا۔ لہٰذا ''معارف فیچر'' بذریعہ ڈاک وصول کرنے والے اصحاب سے یہ گزارش بھی ہے کہ اس کے بند ہونے کی فوری تحریری اطلاع مع اپنے پورے نام اور مکمل و درست پتے کے ہمیں ضرور ارسال فرمائیں۔۔۔ ہم آپ کے تعاون، دعاؤں، مشوروں اور تبصروں کے لیے ممنون ہوں گے۔ (مدیر)

نوٹ:۔ زرِ تعاون اور عطیات کے چیک/ڈرافٹ وغیرہ پر

Islamic Research Academy Karachi

لکھیے/لکھوائیے۔ براہِ کرم کراچی سے باہر کے بینک کا چیک نہ بھیجیے۔ خاصی رقم بینک چارجز کے نام سے کٹ جاتی ہے۔ خط و کتابت اور ترسیلِ زر کے لیے ہمارا پتا ہے:

D-35, Block-5, F.B. Area, Karachi - 75950, Tel: (92-21) 36809201, 36349840

چین کے عزائم

(پہلا حصہ)

ANGELA STANZEL, NADÈGE ROLLAND, JABIN JACOB, MELANIE HART

عالمی سیاست ومعیشت میں چین تیزی سے ابھر رہا ہے۔ اس نے ایک ایسے ملک کی حیثیت اختیار کر لی ہے، جو امریکا اور یورپ کے لیے بہت بڑا خطرہ ہونے کے ساتھ ساتھ کئی ابھرتے ہوئے ممالک کا ساتھی اور معاون بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چین خود بھی مضبوط تر ہوتا جائے گا اور کئی دوسرے ابھرتے ہوئے ممالک کو بھی ساتھ ملا کر عالمی سیاست ومعیشت پر متصرّف ہوتا چلا جائے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا چین نے کوئی طویل المیعاد حکمتِ عملی ترتیب دی ہے؟ چین کے دانشور اس نکتے پر بحث کرنے لگے ہیں کہ آگے چل کر دنیا کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کے حوالے سے چینی قائدین نے کیا سوچ رکھا ہے۔ کئی خطے ہیں جو چین کی طرف سے کسی واضح اشارے کے منتظر ہیں۔ اس معاملے میں افریقا کا کردار خاص طور پر اہم ہے۔

۲۰۱۱ء میں پیکنگ یونیورسٹی میں اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز کے ڈین وانگ جیسی نے کہا تھا کہ ہر ملک طویل المیعاد بنیاد پر کامیابی سے ہمکنار رہنے کے لیے ایک جامع حکمت عملی اپناتا ہے۔ یہ حکمت اس کے مفادات کے تابع ہوتی ہے۔ تمام ممکنہ خطرات کو ذہن نشین رکھتے ہوئے ان کا بہتر انداز سے سامنا کرنے اور مفادات کو زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرنے پر توجہ دی جاتی ہے۔ چین نے ایسی کوئی حکمتِ عملی تیار کی ہے یا نہیں، اس سوال پر بحث ہوسکتی ہے۔ اور یہ کہ چین کی قیادت نے اب تک ایسی کوئی دستاویز طشت از بام نہیں کی ہے جسے چین کی عظیم حکمتِ عملی کے طور پر دیکھا اور پرکھا جاسکے۔

تب سے اب تک چین نے علاقائی اور عالمی میدان میں بہت کچھ کیا ہے، جس سے اس کے عزائم کا اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ چینی قیادت کے بیانات اور مباحث سے بھی بہت کچھ کھل سامنے آرہا ہے مگر اب تک حکومت کی اعلیٰ ترین سطح سے ایسی کوئی جامع دستاویز پیش نہیں کی گئی جس کی بنیاد پر کہا جاسکے کہ چین دو یا تین عشروں میں مجموعی طور پر کیا کرنا چاہتا ہے۔

چینی اسکالر بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ملک کو ایسی جامع حکمتِ عملی کی ضرورت ہے، جو مفادات کا تعین کرتی ہو، ملکی سیاست کے تقاضے پورے کرتی ہو اور خارجہ امور کے حوالے سے قیادت کی بھرپور اور بروقت راہ نمائی کرتی ہو۔ بنیادی طور پر، جیسا وانگ جیسی نے بیان کیا، یہ طے کیا جانا ہے کہ چین کی معاشی وعسکری قوت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کس طور ممکن ہے، سفارت کاری کے میدان میں ملک کس طور آگے بڑھے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیاست، سفارت، معیشت اور عسکری قوت کے حوالے سے مفادات کو زیادہ سے زیادہ تحفظ کس طور فراہم کیا جاسکے گا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ چین کی بڑھتی ہوئی قوت کے پیش نظر امریکا کیا حکمتِ عملی اختیار کرے گا۔ امریکا کو اس پورے معاملے میں کلیدی نکتے کی حیثیت حاصل ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امریکا ایک طرف تو چین کا واضح حریف ہے اور دوسری طرف اس کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر بھی ہے۔ دونوں ممالک اگر عالمی سطح پر بالا دستی کے حوالے سے معرکہ آرائی کریں گے تو معاملات بہت الجھیں گے کیونکہ دونوں کے درمیان تجارت اور سرمایہ کاری کے محاذ پر بھی بہت کچھ مشترکہ ہے۔ چین نے امریکا میں بہت بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ یہ سب کچھ راتوں رات ختم نہیں کیا جاسکتا۔

چائنا یونیورسٹی آف پولیٹیکل سائنس اینڈ لا کے اسکالر کائی ٹو کہتے ہیں کہ عالمی سیاست ومعیشت میں کلیدی کردار ادا کرنے کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے متعلق چینی قیادت کے عزائم کے حوالے سے بحث چین کے دانشوروں نے ۲۰۰۵ء میں شروع کر دی تھی۔ ان ۱۳ برس میں بہت کچھ سوچا اور کہا گیا ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ چین کے لیے اب اپنے علاقے تک محدود رہنا ممکن نہیں رہا۔ وہ عالمی سیاست، معیشت اور سفارت میں بلند تر مقام اور زیادہ نمایاں کردار چاہتا ہے۔ چین نے عسکری قوت میں اضافے پر توجہ دی ہے۔ یہ سب کچھ بہت بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ دنیا بھر میں وہ تمام ممالک چوکنّے ہوگئے ہیں جنہیں چین کے عزائم سے اپنے مفادات خطرے میں پڑتے دکھائی دے رہے ہیں۔ چین کا سب سے بڑا ہتھیار معاشی قوت کا ہے۔ بہت بڑے پیمانے پر پیداوار اور برآمدات نے کئی ممالک کی معیشت کو انتہائی خطرناک صورتِ حال سے دوچار کر رکھا ہے۔ پیکنگ یونیورسٹی کے سالانہ جریدے ''ریویو آف چائنا ز انٹرنیشنل اسٹریٹجی'' سے بھی چین کی طویل المیعاد حکمتِ عملی کے حوالے سے بہت کچھ جاننے کو ملتا ہے۔

۲۰۱۳ء میں شی جن پنگ کے اقتدار میں آنے کے بعد سے چین اندرونی اور بیرونی سطح پر بہت سی تبدیلیوں سے گزرا ہے۔ ایسے میں توقع کی جانی چاہیے کہ چینی اسکالر طویل المیعاد حکمتِ عملی کے حوالے سے بحث کو وسعت دیں گے۔ اب اچانک چین نے بیلٹ اینڈ روڈ انیشیٹیو (بی آر آئی) شروع کیا ہے۔ اس کے تحت نئی شاہراہِ ریشم معرضِ وجود میں لائی جارہی ہے۔ چین پاک اقتصادی راہداری (سی پیک) بھی اسی کا حصہ ہے۔ چین کی نئی جامع حکمتِ عملی میں بحری امور کو بھی خاطر خواہ اہمیت دی گئی ہے۔ چین عالمی بحری راہداریوں میں اپنے لیے کوئی بڑا خطرہ نہیں چاہتا۔ اس کی بحری تجارت اس امر کی متقاضی ہے کہ کوئی بھی قوت راستے میں دیوار کھڑی نہ کرے۔

چین کے سامنے سب سے بڑی دیوار امریکا ہے۔ چینی قیادت کو جو کچھ بھی کرنا ہے امریکا کو ذہن نشین رکھتے ہوئے کرنا ہے۔ چینی قیادت بحری معاملات میں وسیع تر کردار چاہتی ہے۔ چین کی بحریہ بھی علاقائی معاملات سے ہٹ کر بحر ہند میں بہت کچھ کرنے کا عزم رکھتی ہے۔ کئی ممالک سے چین کے دوستانہ تعلقات ہیں۔ ان سے تجارتی روابط بھی ہیں اور چینیوں نے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری بھی کر رکھی ہے۔ ان تمام ممالک کے لیے کسی بھی قسم کا خطرہ ابھرنے کی صورت میں چین کو تیار رہنا ہے تاکہ انہیں یہ احساس ہو کہ مصیبت کی گھڑی میں چین ان کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی سکت ہی نہیں رکھتا، دلچسپی بھی لیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ چین اب بحری معاملات میں زیادہ آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ تجارت اور سرمایہ کاری کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے کر چین اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی خاطر بحری قوت میں اضافے کا پابند ہے۔

چین کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی ترقی کا سفر خاموش رہا ہے۔ اس نے اپنی معاشی قوت میں اضافے کا سفر اس طور جاری رکھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ڈینگ ژیاؤ پنگ کے دور میں اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ چین کی معاشی قوت میں غیر معمولی اضافے کے لیے کچھ سوچا جائے، طویل المیعاد حکمتِ عملی تیار کی جائے۔ تب تک چینی معاشرہ بند تھا۔ فولادی پردے بہت حد تک پڑے ہوئے تھے۔ باہر کی دنیا کو چین کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ تھا۔ ایسے میں لازم تھا کہ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق چینی معاشرے کے دروازے کھولے جائیں۔ ڈینگ ژیاؤ پنگ کے دور ہی میں

چین کو باقی دنیا سے بہتر مراسم کے قابل بنانے کے بارے میں سوچنے کا آغاز ہوا۔ یہ سب کچھ وقت کا تقاضا تھا۔ چین کے لیے باقی دنیا سے زیادہ لاتعلق رہنا ممکن ہی نہ تھا۔ اس حقیقت کو نظر انداز کرنا بھی ممکن نہیں کہ چین نے عشروں کی محنت کے ذریعے اپنے ہاں ہنرمندوں کی ایک فوج تیار کی تھی۔ یہ لوگ مقدر آزمانے کے لیے کہیں بھی جانے کو تیار اور بے تاب تھے۔ اس کے لیے چینی معاشرے کو کھولنا لازم تھا۔ ڈینگ ژیاؤ پنگ نے البتہ اس نکتے پر زور دیا کہ بین الاقوامی معاملات میں زیادہ گرم جوشی دکھانے کے بجائے مرحلہ وار آگے بڑھا جائے تاکہ اندرون ملک کوئی بڑی خرابی پیدا نہ ہو۔ دنیا بھر میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ان کے اثرات چینی معاشرے پر بھی مرتب ہونے لگے تھے۔ لازم تھا کہ لوگوں کی سوچ کنٹرول کرنے کے لیے بین الاقوامی امور میں کچھ مدت کے لیے low profile کی پالیسی اختیار کی جاتی اور وہ اختیار کی گئی۔

یونیورسٹی آف پنسلوانیا میں سیاسیات کے استاد اور فارن پالیسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (فلاڈیلفیا) میں سینئر فیلو ایوری گولڈسٹین کہتے ہیں کہ ۱۹۹۰ء کے عشرے کی آمد کے ساتھ ہی چین میں اعلیٰ ترین سطح پر محسوس کیا جانے لگا تھا کہ اب ایک ایسی جامع اور ہمہ گیر حکمتِ عملی تیار کرنا پڑے گی جو اگلے ڈھائی تین عشروں کے حوالے سے اہداف اور مقاصد کا تعین کرے اور اس حوالے سے قوم کو تیار کرنے کی راہ بھی سُجھائے۔ محض معاشی قوت میں اضافے سے ہٹ کر بھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ چین جدید ترین علوم کے میدان میں آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ملک میں نوجوانوں کی فوج تیار تھی جو بھرپور جوش و جذبے کے ساتھ دنیا بھر میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے لیے بے تاب تھی۔ چین کے ہنرمند پوری دنیا میں پھیل کر زیادہ سے زیادہ زر مبادلہ کمانا چاہتے تھے تاکہ قومی معیشت قابلِ رشک حد تک مستحکم ہو۔

۱۹۹۰ء کے عشرے کی ابتدا نے چین میں اصلاحات کا عمل بھی شروع کیا۔ عوام نے محسوس کیا کہ حکومت انہیں کچھ دینا چاہتی ہے۔ میڈیا پر عائد پابندیوں کو ہلکا کیا گیا۔ لوگوں کو زیادہ کھل کر زندگی بسر کرنے کے قابل بنانے کا عمل شروع کیا گیا۔ دنیا بھر میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ سوویت یونین کی تحلیل سے سرد جنگ بھی ختم ہوئی۔ اس جنگ کے ختم ہونے سے مغرب کی بالادستی کا نیا دور شروع ہوا۔ امریکا واحد سپر پاور تھا۔ یورپ اس کے ساتھ تھا۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد کی دنیا میں دونوں نے مل کر معیشت، سیاست اور سفارت کے میدان میں خوب فوائد بٹورے۔ عالمی مالیاتی نظام کو اپنی مٹھی میں کرنے کے بعد امریکا اور یورپ نے دنیا بھر میں اپنی مرضی کے فیصلے مسلط کیے اور جن ممالک نے بات ماننے سے انکار کیا اُن پر جنگ مسلط کر دی گئی۔ مشرق وسطیٰ کو عدم استحکام سے دوچار رکھنے پر توجہ دی گئی۔ اس کا ایک مقصد تو اس خطے کو ابھرنے سے روکنا تھا اور ضمنی مقصد چین اور دیگر ابھرتی ہوئی قوتوں کو ایک خاص حد تک رکھنا بھی تھا۔

ایوری گولڈسٹین کہتے ہیں کہ چین کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ اس کی ابھرتی ہوئی قوت امریکا اور یورپ کو پریشان نہ کرے اور بھارت کو بھی مشتعل کرنے سے باز رہے۔ وہ بہت خاموشی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ علاقائی ممالک میں سرمایا کاری بڑھانے کے حوالے سے اس نے غیر معمولی احتیاط سے کام لیا۔ چینی قیادت جانتی تھی کہ اگر ملک تیزی سے آگے بڑھے گا تو امریکا اور یورپ ملک کر علاقائی اور عالمی دونوں ہی سطح پر مشکلات پیدا کریں گے۔ بھارت جنوبی ایشیا میں چین کا سب سے بڑا حریف رہا ہے۔ چین کے عزائم بھانپنے کی صورت میں بھارتی قیادت کے بدکنے کا بھی خطرہ تھا۔ چین کے لیے لازم تھا کہ ایسا کوئی اشارا نہ دے جس سے کسی بھی ملک کو خطرات محسوس ہوں۔ چینی قیادت کے لیے یہ سب سے بڑا چیلنج تھا۔

سنگھوا یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل اسٹریٹجک اینڈ ڈیویلپمنٹ اسٹڈیز کے ڈائریکٹر اور CSCAP چائنا نیشنل کمیٹی کے رکن چُو شُو لونگ کہتے ہیں کہ ۱۹۹۷ء میں چینی قیادت نے علاقائی سلامتی کے حوالے سے نئی سوچ اپنائی۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں کو بحیرۂ جنوبی چین اور اس سے ملحق سمندر میں من مانی کرنے سے روکنے کے لیے نئی سیکیورٹی ڈاکٹرائن کا اپنانا لازم تھا۔ چین کو ایشیا و بحرالکاہل کے لیے ایسا سیکیورٹی کا نظام درکار تھا جو ایک طویل مدت تک کارگر ثابت ہو اور کسی بھی بڑی طاقت کے اثرات سے محفوظ ہو۔

اب تک الگ تھلگ رہنے والے چین نے حالات کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے پڑوسیوں سے روابط بہتر بنانا شروع کیے، ایسا کرنا لازم تھا۔ سب سے پہلے اس نے علاقائی سطح پر روابط بہتر بنائے تاکہ آگے چل کر یہی ممالک اس کے بلند تر عزائم سے نہ صرف یہ کہ خوفزدہ نہ ہوں بلکہ اِس کا ساتھ بھی دیں۔ ایک طرف تو چینی قیادت نے جنوب مشرقی ایشیائی ریاستوں کی تنظیم آسیان سے تعلقات بہتر بنانے پر توجہ دی اور دوسری طرف شنگھائی تعاون تنظیم قائم کر کے علاقائی سطح پر وسیع تر اشتراکِ عمل کی راہ ہموار کی۔ شمالی کوریا کے پیدا کردہ جوہری بحران سے نمٹنے کے لیے چھ فریقی مذاکرات میں بھی چین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اکیسویں صدی میں چین نے اب تک معاملات کو بخوبی چلایا ہے اور قدم قدم پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ چین نے علاقائی سطح پر روابط مستحکم ہو جانے کے بعد بین الاقوامی سطح پر بھی اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس نے بین الاقوامی اداروں، تنظیموں اور گروپوں میں بھی اپنی موجودگی یقینی بنانے پر خوب توجہ دی ہے۔ ۲۰۰۲ء میں چین کی کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل جیانگ ژی من نے کہا تھا کہ چین کو اب اپنی حدود سے نکل کر دوسروں کو اپنانا ہوگا اور انہیں یہ احساس دلانا ہوگا کہ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ (--جاری ہے!)

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Grand design: Does China have a 'Grand Strategy'?". ("Publication". Oct. 18, 2017

مجیب الرحمٰن کی ۷ مارچ کی تقریر: سرکاری ملازمین اور تعلیمی اداروں کو دھمکی

بنگلا دیش نیشنل پارٹی کے سیکریٹری جنرل مرزا فخر الاسلام عالم گیر نے الزام لگایا ہے کہ بنگلا دیش کی حکومت نے اپنے ملازمین کو مجیب الرحمٰن کی ۷ مارچ کی تقریر کو سرکاری سطح پر جبراً منانے پر زور دیا ہے۔ دوسری صورت میں ان کی تنخواہیں کم کر دی جائیں گی۔ مزید یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ تعلیمی اداروں کو بھی دھمکی دی گئی ہے کہ اگر اساتذہ اور طالب علموں نے اس میں حصہ نہیں لیا تو ان کے تعلیمی اداروں کو ملنے والے مالی وسائل میں کمی کر دی جائے گی۔ بنگلا دیش میں مجیب الرحمٰن کی اس تقریر کو اقوام متحدہ نے تسلیم کر لیا ہے، جس کے سلسلے میں وہاں تقریبات منائی جاری ہیں۔

| | |

۲۰۱۸ء میں ہونے والے اہم عالمی اجلاس

Stewart M. Patrick

کیا صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی ''سب سے پہلے امریکا'' کی خارجہ پالیسی بین الاقوامی تعاون کے لیے موزوں ہے، جب عالمی رہنما ۲۰۱۸ء میں اہم اجلاسوں میں ملیں گے تو یہ سوال اور زیادہ اہمیت اختیار کرجائے گا۔ ان عالمی اجلاسوں کے بعد ہی واضح ہوسکے گا کہ ٹرمپ انتظامیہ کا پہلا سال امریکا کے بعد کی دنیا کا آغاز ہوگا یا اختتام۔

امریکی ممالک کا سربراہی اجلاس

(۱۳ سے ۱۴ اپریل، پیرو، لیما)

پیرو کے صدر Pedro Pablo Kuczynski امریکی اقوام کے ۳۴ سربراہان مملکت کو آٹھویں اجلاس میں خوش آمدید کہیں گے، یہ اجلاس ہر تین برس بعد منعقد ہوتا ہے، میزبان کا کردار اہم ہے، کیونکہ پیرو کی حکومت مستحکم ہے اور گزشتہ دہائی سے معیشت کی شرح نمو ۵.۹ فیصد سالانہ ہے، لیکن پڑوسی ممالک کے حالات بہتر نہیں، معیشت جمود کا شکار ہے، آمریت قائم ہے اور تشدد جاری ہے، پیرو کے صدر پر اختیارات کا غلط استعمال کرکے ذاتی فائدے اٹھانے کے سنگین الزامات تھے اور وہ مواخذے کی تحریک سے بمشکل ہی بچ پائے ہیں، پیرو کی حکومت نے اسی مناسبت سے اجلاس کا موضوع چُنا ہے، ''کرپشن روکنے کے لیے جمہوری بندوبست''۔ اس میں تمام رکن ممالک کی سول سوسائٹیز کے لوگ بھی شریک ہوں گے، تاکہ بدعنوانی کے خاتمے کے حوالے سے بات چیت آگے بڑھائی جائے۔ لیما سمٹ صدر ٹرمپ کا امریکی ممالک کے حوالے سے پہلا سربراہی اجلاس ہوگا۔ ٹرمپ انتظامیہ کی جانب سے امیگریشن اور منشیات پر سخت موقف اپنایا جائے، کیوبا اس اجلاس میں سب سے متنازعہ مسئلہ بن کے ابھرے گا۔

G-7 سربراہی اجلاس (۸ سے ۹ جون تک، کینیڈا)

امریکا کے سب سے اہم مغربی اتحادیوں کے ساتھ مئی ۲۰۱۷ء میں صدر ٹرمپ کی سسلی میں ملاقات کافی تلخ رہی تھی، ماحولیات اور تجارتی پالیسی کے حوالے سے اپنے سخت رویے کی وجہ سے ٹرمپ تنہا رہ گئے تھے، جون میں ٹرمپ کے پاس ایک بار پھر معاملات کو ٹھیک کرنے کا موقع ہوگا، جب جی سیون گروپ کے ممالک وزیراعظم جسٹن ٹروڈو کی صدارت میں اجلاس میں ملیں گے تو کینیڈا چار موضوعات پر گفتگو کے لیے توجہ کا مرکز ہوگا، جس میں پہلا، مجموعی ترقی کے لیے سرمایہ کاری۔ دوسرا، موسمیاتی تبدیلی سے نمٹنا۔ تیسرا، امن اور سلامتی کو مضبوط بنانا اور چوتھا موضوع، صنفی مساوات کو فروغ دینا ہوگا۔ کینیڈا اور دیگر جی سیون ممالک کے حکام پریشان ہیں کہ امریکی صدر کی جانب سے ان موضوعات کی شدید مخالفت پر ایجنڈا کیا ہوگا، کیا اجلاس واقعی میں جی سیون ممالک کا سربراہی اجلاس ثابت ہوگا یا ''جی ۶'' جمع ''ایک'' کا اجلاس بن جائے گا۔

یوروسربراہی اجلاس (۲۸ سے ۲۹ جون، برسلز)

یورپ برطانیہ سے بریگزٹ پر سال بھر مشکل مذاکرات کے بعد نیا آغاز کرنا چاہتا ہے۔ یورپی یونین کے باقی رہ جانے والے ۲۷/ارکان ممالک مل کر یورپ کو ایک رکھنے کے منصوبے کا دوبارہ سے آغاز کریں گے۔ یورپی کمیشن کا مقصد جون ۲۰۱۸ء تک معاشی اور مالیاتی تعلقات کو مزید گہرا کرنے کے لیے ایک معاہدے تک پہنچنا ہے، یورپی کمیشن کے صدر جین کلاڈ جنکر نے ۶ دسمبر کو اس حوالے سے راستہ متعین کردیا ہے، ان کا کہنا تھا کہ ''کئی برسوں کے بحران کے بعد اب وقت آگیا ہے کہ یورپ کا مستقبل اپنے ہاتھ میں لیا جائے، اس معاہدے کا بنیادی مقصد یورپین مانیٹری فنڈ قائم کرنا ہے، جس کے ذریعے تباہ حال بینکوں کو قرضے فراہم کیے جائیں گے۔ اس منصوبے میں نئی یورپی وزارت خزانہ کی تشکیل بھی شامل ہے، اس کے ساتھ نئے یورپی بجٹ کے لوازمات بھی شامل ہیں تاکہ یوروزون میں استحکام قائم رہے۔

نیٹو سربراہی اجلاس (۱۱ سے ۱۲ جولائی، برسلز)

صدر ٹرمپ کے منفی رویے کا نیٹو کے گزشتہ اجلاس میں غلبہ رہا تھا، اجلاس میں صدر ٹرمپ نے امریکا کے پیسے پر مفت میں مزے کرنے پر اتحادیوں پر شدید تنقید کی، جو یادگار رہے گی۔ انہوں نے چھوٹے ممالک کے رہنماؤں کو دیوار سے لگا دیا، بہرحال انہوں نے نیٹو کے آرٹیکل ۵ کے تحت امریکا کی مشترکہ دفاع کی ذمہ داریوں کو غصے میں تسلیم کیا۔ خوش قسمتی سے ۲۰۱۸ء کے سربراہی اجلاس میں اہم معاملات اور ان کے حل پر توجہ دی جانی ہے، اس میں کثیرالملکی فوجوں میں اصلاحات کا ایجنڈا شامل ہے۔ ان فوجوں کو حال ہی میں ایسٹونیا، لٹویا اور لتھونیا میں تعینات کیا گیا تھا۔ بلیک سی میں نیٹو کی موجودگی کو بہتر بنانا، روس کا سامنا کرنے کے لیے نیٹو کے سائبر دفاع اور ہائبرڈ جنگی اہلیت میں اضافہ کرنا اور داعش کو تباہ کرنے کا ایک بار پھر عزم کرنا شامل ہیں۔ یورپ کی جانب سے مل کر بوجھ اٹھانے کے وعدے ٹرمپ انتظامیہ کو ٹھنڈا کرنے میں مددگار ہوسکتے ہیں، جس سے صدر ٹرمپ اپنی ''مفت میں بوجھ نہ اٹھانے'' کی مہم کی کامیابی کا اعلان بھی کرسکتے ہیں۔

''برکس'' سربراہی اجلاس (جوہانسبرگ)

جنوبی افریقا برکس کے دسویں اجلاس میں برازیل، روس، انڈیا اور چین کی میزبانی کرے گا۔ ابھرتی ہوئی معیشت والے ممالک کا یہ اجلاس میزبان اور مہمان دونوں کے لیے مشکل مرحلہ ہوگا، افریقن نیشنل کانگریس پارٹی گزشتہ ۲۵ برس سے ملک میں برسراقتدار ہے۔ صدر جیکب زوما کو بدعنوانی اور بڑھتی ہوئی غربت کی وجہ سے شدید عوامی غصے کا سامنا ہے، حالانکہ جنوبی افریقا اب بھی براعظم کا سب سے امیر ملک ہے، اس مرتبہ پھر بلند پرواز ''برکس'' ممالک کو پرانے سوالات کا سامنا کرنا ہوگا، ان ممالک کے سیاسی اور معاشی نظام کے حوالے سے، ان کے اسٹریٹیجک مفادات کے حوالے سے، یہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ برکس ممالک میں دنیا کی ۴۰ فیصد آبادی رہتی ہے اور دنیا کی ایک چوتھائی دولت ان کے پاس ہے۔ مغرب کی طرح برکس ممالک کے پاس اب تک کوئی واضح مشترکہ پروگرام نہیں ہے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا افتتاحی اجلاس

(۱۸ سے ۲۵ ستمبر، نیویارک)

شمالی کوریا کو مکمل تباہ کرنے کی دھمکی دینے کے ایک برس بعد نیویارک اجلاس میں صدر ٹرمپ عالمی رہنماؤں سے ملاقات کے دوران بہتر سفارتکاری کا مظاہرہ کریں گے۔ اس امید کے ساتھ کہ جنگ اچانک شروع نہیں ہوگی، ٹرمپ انتظامیہ شمالی کوریا پر اقوام متحدہ کی پابندیوں کو مزید سخت کرنے کی کوشش کرے گی اور ایران پر ۲۰۱۵ء کے جوہری معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام لگایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی ممکنہ طور پر امریکا پناہ گزینوں سے بہتر سلوک کے حوالے سے اقوام متحدہ کے دو معاہدوں کی توثیق سے انکار کرے گا۔ یہ معاہدے اجلاس میں سب سے اہم ہوں گے، اجتماعیت کے بجائے اپنی پسند اور ناپسند پر فیصلے کرنا ایک ایسے وقت میں امریکا کو تنہا کردے گا، جب وہ دیگر ممالک کی حمایت کا خواہاں ہے۔ ٹرمپ انتظامیہ اسرائیل اور فلسطین کے معاملے پر تنہا ہوچکی ہے، جیسا امریکا کی طرف سے یروشلم کو اسرائیل کا

دارالحکومت تسلیم کرنے پر جنرل اسمبلی نے ردعمل کا اظہار کیا تھا، یہ امریکا کی تنہائی کو مزید بڑھا دے گا۔

ہمارا سمندر اجلاس (بالی)

انڈونیشیا ''ہمارا سمندر'' کے نام سے ہونے والی کانفرنس کے پانچویں ایڈیشن کی میزبانی ۲۰۱۸ء کے موسم خزاں میں کرے گا، یہ تنظیم ۲۰۱۴ء میں امریکی وزیر خارجہ جان کیری کی قیادت میں تشکیل دی گئی، ہر سالانہ اجلاس میں اقوام متحدہ کے ممبر ممالک، بین الاقوامی تنظیمیں، کارپوریشنز، فاؤنڈیشنز، غیر سرکاری تنظیمیں اور تحقیقاتی ادارے سمندر کی بدترین صورتحال کو بہتر کرنے کے لیے تبادلہ خیال کرتے ہیں، اجلاس کا ایجنڈا بہت طویل ہے، جس میں نیوی کے زیر حفاظت علاقے میں توسیع، موسمیاتی تبدیلیوں سے نمٹنا، پائیدار ماہی گیری کو فروغ دینا، سمندر میں آلودگی کو کم کرنا، میری ٹائم سیکیورٹی کو بہتر بنانا، بلیو اکانومی کو فروغ دینا شامل ہیں۔ انڈونیشیا سترہ ہزار سے زائد جزائر کا ملک ہے، یہ سمندر کو پلاسٹک سے آلودہ کرنے والا دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے۔ اس اجلاس کے لیے اس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی، آج ٹرمپ انتظامیہ کو سمندر کے تحفظ میں دلچسپی نہیں ہے اور اس پالیسی میں تبدیلی کا امکان بہت کم ہے۔

''جی ۲۰'' سربراہی اجلاس

(۳۰ نومبر سے یکم دسمبر تک، بیونس ایئرز، ارجنٹینا)

ایک عرصے سے ''جی ۲۰'' ممالک میں کوئی فیصلہ کرنے کے بعد دوبارہ غور کرنے کا سلسلہ جاری ہے، جنوبی امریکا میں گروپ کے پہلے اجلاس میں ارجنٹینا نے بھرپور اعتماد اور سنجیدگی کا مظاہرہ کرنا ہوگا، مقامی طور پر دیکھا جائے تو یہ وقت اجلاس کے لیے بہتر نہیں، صدر ماریسیو ماکری کی قیادت ابھی تک مقبول ہے، ارجنٹینا مقبول سیاست سے گریز کر رہا ہے، سابق صدر کی پالیسوں کو تحفظ دیا جا رہا ہے، اس کے ساتھ ملک کے مقامی انتظامی امور اور دیگر ممالک سے تعاون میں بہت بہتری آئی ہے، گزشتہ اجلاسوں کے میزبانوں کی طرح ارجنٹینا کا بھی جی 20 اجلاس کا ایجنڈا اقتصادی مسائل ہوں گے تاکہ وسیع چیلنجز سے نمٹا جاسکے، ارجنٹینا نے بحث کے لیے تین موضوعات کو منتخب کیا ہے۔ پہلا کام کا مستقبل، دوسرا، تعلیم، روزگار اور مساوات پر ایجادات اور مشینوں کے اثرات، تیسرا، مضبوط زراعت کے ذریعے خوراک کی حفاظت میں بہتری لانا ہے۔

باقی صفحہ نمبر ۲

امریکی فوج کی کارروائیوں میں اضافہ

Anthony Capaccio

ٹرمپ انتظامیہ کی افغانستان کے حوالے سے جارحانہ حکمتِ عملی کے بعد پینٹا گون نے پہلی دفعہ امریکی فوج کے خصوصی دستوں کی جانب سے کیے گئے آپریشنز کی تفصیلات جاری کی ہیں۔ جس میں ٹرمپ کے آنے کے بعد طالبان، حقانی نیٹ ورک اور داعش پر حملوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔

پینٹا گون کی جانب سے جاری کی جانے والی ششماہی رپوٹ کے مطابق یکم جون سے لے کر ۲۴ نومبر تک امریکی جوائنٹ اسپیشل آپریشنز ٹاسک فورس برائے افغانستان (JSOTF) نے ''۲۱۷۵'' زمینی آپریشن کیے، جن میں افغانستان کے فوجی کمانڈو بھی ساتھ رہے۔

اگرچہ اعداد و شمار میں ٹرمپ کی جارحانہ پالیسی کا واضح عکس دکھائی دیتا ہے، جس کے تحت انھوں نے مقامی کمانڈروں کو کارروائیاں کرنے کے حوالے سے کافی حد تک خودمختاری دی تھی، لیکن ان اعداد و شمار کے ذریعے آپریشنز کی کامیابی، ان کے اثرات اور ان کی نوعیت کا موازنہ کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔

۱۵ دسمبر کو کانگریس کے سامنے پیش کی گئی اس تازہ ترین رپوٹ میں کہا گیا ہے کہ امریکی خصوصی فوج کے دستوں نے افغانستان میں انسداد دہشت گردی کے لیے جو اپریشن کیے ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ داعش کے خلاف ۴۲۰ زمینی آپریشن کیے گئے جبکہ ۲۱۴ فضائی حملے کیے گئے، جس کے نتیجے میں داعش سے تعلق رکھنے والے ۱۷۴ لوگ مارے گئے۔ ان میں عراق اور شامی داعش کے سربراہ ابوسعید بھی شامل ہیں۔ جن کی موت کا ذکر ۱۱ جولائی کو پینٹا گون کی ترجمان Dana W. White نے بھی اپنے بیان میں کیا تھا۔ ان کو کنٹر میں موجود اس گروہ کے ہیڈ کوارٹر میں مارا گیا۔

۲۔ طالبان کے خلاف ۱۶۴۴ زمینی اور ۱۸۱ فضائی حملے کیے گئے، جن میں ۲۲۰ عسکریت پسند مارے گئے۔

۳۔ حقانی نیٹ ورک کے خلاف ۶۸ زمینی اور ۲۸ فضائی کارروائیاں کی گئیں، جن کے نتیجے میں ۳۴ افراد ہلاک ہوئے۔

۴۔ دیگر عسکریت پسندوں کے خلاف ۴۳ آپریشن کیے گئے، جن کے نتیجے میں ۳۶ افراد مارے گئے۔

اس رپورٹ میں حملوں کے نتیجے میں مارے جانے والے بے گناہ افراد کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا، جن کے بارے میں انسانی حقوق کی تنظیموں کا کہنا ہے کہ ٹرمپ کے دور صدارت میں بے گناہ افراد کی ہلاکت میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔

Kenneth Katzman جو کہ کانگریشنل ریسرچ سروس کے تجزیہ نگار ہیں اور افغانستان کے حوالے سے خصوصی تجربہ رکھتے ہیں، انھوں نے کہا ہے کہ اس رپورٹ کو شائع کرنے کا مقصد بھی یہی لگتا ہے کہ صدر ٹرمپ کے دور میں اپنائی گئی جارحانہ پالیسی کا ثبوت دیا جاسکے۔ اور ٹرمپ اس جنگ کو روکنے کے بجائے جیتنا چاہتے ہیں۔

Katzman کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ عسکریت پسندوں کے لیے بھی ایک اشارہ ہے کہ وہ مستقبل قریب میں کوئی فوجی کامیابی حاصل نہیں کرسکتے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ پُرامن طریقے سے مذاکرات پر راضی ہوجائیں۔

۲۰۰ فوجیوں پر مشتمل اسپیشل آپریشن ٹاسک فورس میں ۱۲۰۰ فوجی وہ بھی ہیں جن کو ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کی خصوصی تربیت دی گئی ہے۔ اس فورس کے ترجمان میجر انتھونی کا کہنا ہے کہ اس فورس میں مختلف مشیر اور دیگر ماہرین بھی شامل ہیں، اور یہ فورس افغانستان میں تعینات ۱۴۰۰۰ فوجیوں میں سے ہی ہے۔

یہ اسپیشل آپریشن ٹاسک فورس افغان فوج کے کمانڈو یونٹ کی خصوصی تربیت پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے اور اس کی کوشش ہے کہ اس مقامی فوج کی اہلیت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جاسکے۔

ایئر فورس کے کرنل مائیکل اینڈریو جو کہ پینٹا گون کے ترجمان ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یہ سال ہماری فوج اور خاص کر کمانڈو یونٹ کے لیے نہایت اہم تھا، اسی لیے اس کے اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں۔ امریکی کمانڈوز نے افغان فوج کے ساتھ مل کر اور ان کی مدد کے لیے بہت سے آپریشن کیے۔

(ترجمہ: حافظ محمد نوید نون)

"U.S. touts Afghanistan special-operations raids in rare detail".
("bloomberg.com". December 21, 2017)

ایک اور طرح کے گمشدہ افراد

ڈاکٹر مہتاب ایس کریم

۲۰۱۷ء کی مردم شماری کے نتائج ماہرینِ آبادیات سمیت تمام سماجی طبقات کے لیے حیران کن ہیں اور وہ ان نتائج کی صحت پر سراپا سوال ہیں۔ ادارہ شماریات کی جانب سے جاری کیے گئے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کی آبادی تقریباً ۲۰ کروڑ ۷۸ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ عدد حکومت کی جانب سے لگائے گئے تخمینے سے ایک کروڑ زیادہ ہے۔ حکومتِ پاکستان کے اندازے کے مطابق ۱۹۹۸ء سے ۲۰۱۷ء تک ملکی آبادی ۲ فیصد بڑھنے کے امکانات تھے، تاہم مردم شماری کے نتائج کے مطابق آبادی میں اضافے کا تناسب ۲ء۴ فیصد رہا ہے۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ سندھ کی آبادی گزشتہ ۱۹ برسوں میں بالکل نہیں بڑھی، اور اس پر مستزاد یہ کہ ۱۹۸۱ء کے بعد سے اب تک، ۳۴ برسوں میں سندھ کی آبادی میں اضافے کی حد بہت کم بڑھ پائی۔ پنجاب کی آبادی میں سالانہ اضافے کی شرح قومی اور دیگر صوبائی آبادیوں میں اضافے کی اوسط شرح سے روایتی طور پر کم رہی، جو کہ ۲ء۱ فیصد ہے اور صوبے میں شرح پیدائش میں کمی کی غماز ہے۔ خیبر پختونخوا اور بلوچستان کی آبادی میں اضافے کی شرح بالترتیب ۲ء۹ فیصد اور ۳ء۴ فیصد رہی، جو کہ ملکی آبادی میں اضافے کی اوسط شرح سے خاطر خواہ زیادہ ہے، غالباً افغان مہاجرین کا یہاں رچ بس جانا آبادی میں اضافے کی ممکنہ وجہ ہوسکتی ہے۔

سندھ کی آبادی میں اضافے کی شرح گزشتہ ۳۴ برسوں میں انتہائی کم رہی ہے۔ جبکہ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۱ء تک سندھ کی آبادی میں اضافے کی شرح ۳ء۹ فیصد تھی، جبکہ ۱۹۹۸ء اور ۲۰۱۷ء کے نتائج کے مطابق سکڑ کر ۲ء۴ فیصد رہ گئی ہے۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۱ء تک، ۳۰ سالوں میں سندھ کی آبادی میں اضافے کی شرح ۴ء۵ فیصد رہی، آبادی میں یہ خاطر خواہ اضافہ دیگر علاقوں کے لوگوں کے کراچی میں آبسنے سے ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں ملکی آبادی میں سندھی آبادی کا حصہ ۱۸ فیصد تھا، جبکہ ۳۰ سال بعد یہ حصہ ۲۳ فیصد تک بڑھ چکا تھا۔ تاہم ۱۹۸۱ء سے ۲۰۱۷ء تک اس رجحان میں قابلِ ذکر حد تک کمی آئی اور سندھ کی آبادی محض ۰ء۴ فیصد تک بڑھ سکی۔ آخری تین عشروں میں پہلے تین عشروں کی نسبت آبادی میں اضافے کی شرح میں حیرت انگیز کمی کی کئی ممکنہ وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اول یہ کہ سندھ میں شرح پیدائش باقی صوبوں کی نسبت انتہائی کم رہی، دوم یہ کہ دیگر صوبوں کے عوام میں کراچی کی طرف نقل مکانی کے رجحان میں خاطر خواہ کمی آئی۔ اور سوم یہ کہ آخری دو مردم شماریوں میں سندھ کی آبادی کے نتائج میں کمی بیشی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

پاکستان ان چند ایشیائی ممالک میں سے ایک ہے جہاں شرح پیدائش میں کمی کی رفتار انتہائی سست ہے۔ تاہم شرح پیدائش میں کمی کے مجموعی رجحان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پاکستان کے تمام صوبوں میں یہ رجحان تقریباً برابر ہے۔ تاہم اوسطاً پنجاب میں ایک خاتون کے ہاں سندھی خاتون کی نسبت بچوں کی تعداد کم از کم نصف ہے۔ دیگر دو صوبوں کے رجحانات کے بارے میں کوئی معلومات موجود نہیں ہیں۔ قیامِ پاکستان سے اب تک دیہاتوں سے شہروں اور بالخصوص کراچی کی جانب لوگوں کی کثیر تعداد میں نقل مکانی کے رجحان کے سبب سندھ کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنے میں آیا۔ یہ ہجرت اسی اور نوے کی دہائیوں میں جاری رہی۔ ۱۹۹۸ء کے بعد کے عشرے میں تقریباً ۳۸ لاکھ افراد نے دیہاتوں سے شہروں کی طرف ہجرت کی، جبکہ ان میں سے نصف تعداد دیگر صوبوں اور نصف افراد اپنے ہی صوبے کے دیگر علاقوں میں رہائش پذیر ہوئے۔ تاہم مختلف صوبوں میں نقل مکانی کا یہ رجحان مختلف رہا۔ مثال کے طور پر سندھ میں آبسنے والے ۷۱ فیصد افراد دیگر صوبوں سے ہجرت کر کے آئے۔ جبکہ پنجاب اور خیبر پختونخوا میں نقل مکانی کرنے والے افراد کی اکثریت نے اپنے ہی صوبے کے دیگر اضلاع میں رہائش اختیار کی۔ ۱۹۹۸ء کی مردم شماری میں بین الصوبائی اور بین الاضلاعی نقل مکانی کو نظر انداز کیے جانے کی وجہ سے ان رجحانات کا صحیح تخمینہ نہیں لگایا جاسکا۔ تاہم یہ بات بالکل واضح ہے کہ گزشتہ دو عشروں کے دوران دیگر صوبوں کے اضلاع سے کراچی کی طرف نقل مکانی کا قابلِ ذکر رجحان موجود رہا ہے۔

گزشتہ مردم شماریوں کے برعکس ۲۰۱۷ء کی مردم شماری کسی بھی فرد کی مستقل رہائش کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ اسی لیے دیگر صوبہ جات سے سندھ نقل مکانی کر جانے کے باوجود جن افراد کے شناختی کارڈز پر ان کے پیدائشی صوبے کا پتہ درج ہے، انہیں اسی صوبے کا شہری تسلیم کیا گیا ہے۔ پھر بھی مذکورہ مردم شماری کے نتائج درست نہیں ہیں اور ان میں کمی بیشی کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ ان نتائج کی صحت جانچنے کے لیے ''بعد از مردم شماری شماریاتی جائزہ'' لینا ضروری ہے جس کا طریقہ کار عالمی سطح پر مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ کئی ممالک میں رائج بھی ہے۔ اس طریقہ کار میں کسی بھی منتخب علاقے کی آبادی کا جائزہ لے کر اسی علاقے کے مردم شماری کے نتائج سے موزانہ کیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر امریکا میں ۱۹۵۰ء کی مردم شماری کے بعد لیے گئے شماریاتی جائزے کے مطابق مردم شماری میں ۵ فیصد لوگ شمار نہیں کیے جاسکے تھے۔ ۱۹۹۰ء میں شمار نہ کیے جانے والے افراد کی شرح ۹ء۱ فیصد تھی۔ ۲۰۰۱ء کی آسٹریلوی مردم شماری کے بعد کے شماریاتی جائزے کے مطابق مردم شماری میں ۲ فیصد لوگ شمار نہیں کیے جاسکے تھے۔ اسی طرح ۲۰۱۱ء میں بھارت میں ۳ء۲ فیصد اور بنگلادیش میں ۲ء۴ فیصد افراد شماریاتی عمل میں شمار نہیں کیے جاسکے تھے۔ پاکستان میں ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے بعد لیے گئے شماریاتی جائزے کے مطابق مردم شماری میں ۷ء۶ فیصد افراد کا شمار نہیں کیا گیا تھا، بعد ازاں اس جائزے کی بنا پر مردم شماری کے نتائج میں موزوں اضافہ کیا گیا۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے بعد بھی شماریاتی جائزے کا اہتمام کیا گیا، تاہم اس کے نتائج راز ہی رہے۔ ۱۹۹۸ء کی مردم شماری کے بعد ایسے کسی جائزے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور اب ۲۰۱۷ء میں ایسا کوئی لائحہ عمل ترتیب نہیں دیا گیا۔

مردم شماری کے نتائج کو آبادیاتی خاکہ نگاری کے عمل کے ذریعے بھی پرکھا جاسکتا ہے، جس میں دو مردم شماریوں کے

''معارف فیچر'' حاصل کرنے کے خواہشمند خواتین و حضرات اور اداروں سے گزارش ہے کہ اپنے نام اور پتے کے ساتھ (رضاکارانہ طور پر) =/۵۰۰ روپے کا ڈاک ٹکٹ یا کراچی کے کسی بینک کا اتنی مالیت کا چیک ''اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی'' کے نام ارسال کریں۔ آپ کا بینک بیرونِ کراچی ہو تو پھر بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر بھیجیں۔ زرِ خریداری موصول ہوجانے کے بعد آپ کے دیے ہوئے پتے پر ''معارف فیچر'' کی ترسیل شروع ہوجائے گی۔ ان شاء اللہ!

درمیان کسی بھی وقت میں میسر پیدائش و وفات اور نقل مکانی کے اعداد وشمار پر مبنی آبادیاتی اشاریوں کی مدد سے ان رجحانات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ۱۹۹۸ء کی مردم شماری کے نتائج جانچنے کے لیے اقوامِ متحدہ اور پاکستان کی جانب سے قائم کی گئی جائزہ کمیٹی کے رکن کے طور پر میں نے ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۷ء تک کیے گئے آبادیاتی جائزوں کے اعداد وشمار کو بغور دیکھا۔ اس دوران میں نے ۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۸ء تک امریکا، یورپ اور خلیجی ممالک کی جانب سے نقل مکانی کر جانے والے افراد کے اعداد وشمار اکٹھے کیے گئے۔ ان اعداد وشمار کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مردم شماری میں ۶۰ لاکھ افراد کو شمار نہیں کیا گیا اور ان میں افراد کی اکثریت سندھ سے تعلق رکھتی تھی۔ بدقسمتی سے پاکستان میں ۲۰۰۷ء کے بعد سے اس طرح کے آبادیاتی جائزے نہیں لیے جاسکے، اسی لیے ملک کے تمام صوبوں میں آبادی کی عددی تقسیم کے متعلق کوئی تخمینہ لگانا انتہائی مشکل ہو چکا ہے۔ بین الصوبائی اور بین الاضلاعی نقل مکانی کی بابت گزشتہ مردم شماریوں میں پوچھے گئے سوالات کو ۲۰۱۷ء کی مردم شماری سے خارج کر دیے جانے کی بنا پر بین الصوبائی نقل مکانی کے رجحانات کا اندازہ ممکن نہیں ہے۔ قیامِ پاکستان سے مسلسل سندھ کی جانب نقل مکانی کے بے ہنگم رجحان کے سبب سندھ کی آبادی کا ملکی آبادی میں تناسب پہلے ۳۳ برسوں میں ۱۸ فیصد سے ۲۳ فیصد تک بڑھا، تاہم گزشتہ دونوں مردم شماریوں کے مطابق تقریباً ۳۶ برس میں آبادی کا تناسب ۲۳ فیصد تک ہی رہا اور اس میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں ہوا۔

اعداد وشمار کے تجزیے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سندھ میں فی گھر رہائش پذیر افراد کی اوسط تعداد ۱۹۸۱ء، ۱۹۹۸ء اور ۲۰۱۷ء میں بالترتیب ۶ء۸، ۶ء۳ اور ۵ء۶ رہی، جو فی گھر افراد کی اوسط تعداد میں بتدریج تنزلی کی عکاس ہے۔ بلوچستان میں بھی اسی قسم کا رجحان سامنے آتا ہے، جہاں ۱۹۸۱ء میں فی گھر افراد کی اوسط تعداد ۷ء۲ تھی، جو ۲۰۱۷ء میں ۷ تک گر چکی ہے۔ جبکہ دوسری طرف پنجاب میں یہ عدد ۱۹۸۱ء میں ۶ء۳، ۱۹۹۸ء میں ۷ اور ۲۰۱۷ء میں ۶ء۴ کی حد پر رہا۔ اسی طرح خیبر پختونخوا میں یہ حد ۱۹۸۱ء میں ۶ء۸ جبکہ ۲۰۱۷ء میں ۷ء۹ تک بڑھی۔ جبکہ یہ عین ممکن ہے کہ شرح پیدائش میں کمی کی سست روی اور نئے گھروں کی عدمِ تعمیر کے باعث فی گھر افراد کی اوسط تعداد میں اضافہ ہوا ہو، لیکن یہی رجحان سندھ میں کیوں دیکھنے میں نہیں آیا، جبکہ دیگر صوبوں کی نسبت سندھ میں آبادی کا بہاؤ زیادہ رہا۔ کیا ۱۹۹۸ء اور ۲۰۱۷ء کی مردم شماری میں سندھ میں فی گھر افراد کی اوسط تعداد میں تنزلی اس بات کی غماز ہے کہ سندھ کی آبادی کو کم ظاہر کیا گیا ہے؟

۱۹۹۸ء اور ۲۰۱۷ء کی مردم شماریوں کے اعداد وشمار کا ادارہ شماریات کی جانب سے لیے گئے سالانہ جائزوں کے نتائج سے موازنہ کیا جائے تو ان میں مطابقت پیدا نہیں ہوتی۔ گزشتہ برسوں کے سالانہ گھریلو حجم کے جائزوں کے مطابق پنجاب میں فی گھر افراد کی اوسط تعداد ۶ء۱ جبکہ سندھ میں ۶ء۵ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ حالیہ مردم شماری میں سندھ میں فی گھر ایک فرد اور بلوچستان میں فی گھر نصف فرد کم شمار کیا گیا۔ جبکہ پنجاب میں فی گھر اعشاریہ تین فرد اور خیبر پختونخوا میں فی گھر اعشاریہ سات فرد زائد شمار کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں لگائے گئے تخمینوں کے مطابق سندھ اور بلوچستان میں بالترتیب ستر لاکھ ۹۰ ہزار اور ۶ لاکھ افراد کم شمار کیے گئے، جبکہ پنجاب اور خیبر پختونخوا میں بالترتیب ۵۰ لاکھ ۷۰ ہزار اور ۲۰ لاکھ ۸۰ ہزار افراد زیادہ شمار کیے گئے ہیں۔ اعداد وشمار میں کسی بھی نوعیت کی کمی بیشی نہ ہونے کے مفروضے کی بنیاد پر ترمیم شدہ نتائج کے مطابق ملکی آبادی میں سندھ اور بلوچستان کا تناسب بالترتیب ۲۶ء۹ اور ۶ء۲ فیصد تک بڑھ جائے گا، جبکہ دوسری جانب پنجاب کی آبادی کا تناسب کم ہو کر ۵۰ اعشاریہ ۲ فیصد اور خیبر پختونخوا کی آبادی کا تناسب کم ہو کر ۱۳ اعشاریہ ۳ فیصد تک ہو جائے گا۔ اگر ۲۰۱۱ء سے ۲۰۱۶ء کے دوران ہونے والے سالانہ جائزوں میں بیان کیے گئے اوسط گھریلو حجم کو زیرِ غور لایا جاتا ہے تو ملکی آبادی میں ازسرِنو مطابقت پیدا کرنی پڑے گی، جس کے تحت ملکی آبادی میں صوبائی آبادیاتی تناسب بدل جائیں گے۔ سندھ اور بلوچستان کے آبادیاتی تناسب میں اضافہ اور خیبر پختونخوا اور پنجاب کے آبادیاتی تناسب میں کمی واقع ہوگی۔ غرضیکہ اگر ۲۰۱۷ء کی مردم شماری صحیح طور پر کی جاتی ہے تو قومی مالیاتی ایوارڈ اور مقننہ میں سندھ کی شراکت کا حجم کافی حد تک بڑھ سکتا ہے۔

مردم شماری کے نتائج کی جانچ کے لیے بین الاقوامی معیارات کی عدم موجودگی کے باعث اگر ۲۰۱۷ء کی مردم شماری کے نتائج کو من وعن قبول کر لیا جاتا ہے تو ایک طرف سندھ اور بلوچستان میں بے چینی و عدم اطمینانی کے جذبات جنم لیں گے تو دوسری طرف یہ چیز ہمیں تباہ کن پالیسی سازی کی جانب لے جائے گی۔ بعد از مردم شماری شماریاتی جائزے کی مدد سے شماریاتی نتائج کی جانچ کیے بغیر حالیہ مردم شماری کے نتائج کو ہو بہو قبول کرنا قطعاً ملکی مفاد میں نہیں ہے۔ ادارہ شماریات پاکستان کو یہ توثیقی عمل ماہرینِ آبادیات اور مستند جامعات کے شعبہ شماریات کی مدد سے انجام دینا چاہیے۔ اگر ۲۰۱۷ء کی مردم شماری کے بعد شماریاتی جائزے کا اہتمام کیا جاتا تو مردم شماری کے نتائج میں کسی بھی طرح کی کمی بیشی کو کم سے کم سطح تک لایا جاسکتا تھا۔ ادارہ شماریات کے ساتھ منعقدہ ایک مجلس میں ماہرینِ آبادیات نے ایک شماریاتی جائزے کی تجویز پیش کی تھی، تاہم اس خوف سے اس تجویز کی مخالفت کی گئی کہ کہیں مردم شماری کے نتائج شماریاتی جائزے سے متصادم نہ ہوں۔ ابھی بھی وقت ہے کہ ملک کے ۲ فیصد منتخب آبادیاتی حلقوں کا شماریاتی جائزہ لے کر ملکی آبادی کا صحیح تعین کیا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ عمل ادارہ شماریات پاکستان کے تعاون سے ہی پایہ تکمیل کو پہنچایا جاسکتا ہے۔ اخباری ذرائع کے مطابق سندھ حکومت نے ادارہ شماریات سے مردم شماری کے نتائج کی دستاویزات طلب کی تھیں، تاکہ ان نتائج کی صحت کا جائزہ لیا جاسکے، لیکن سندھ حکومت کی اس درخواست کو نامنظور کر دیا گیا۔ یہ طرزِ عمل نہ صرف یہ کہ شفافیت کے اصولوں کے خلاف ہے بلکہ اگر اعداد وشمار میں واقعتاً فرق ہے، تو اس کے پالیسی نتائج ضرور نقصان دہ ثابت ہوں گے۔

(بحوالہ: ''تجزیات ڈاٹ کام''۔ ۲۳ دسمبر ۲۰۱۷ء)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ نئی کتاب

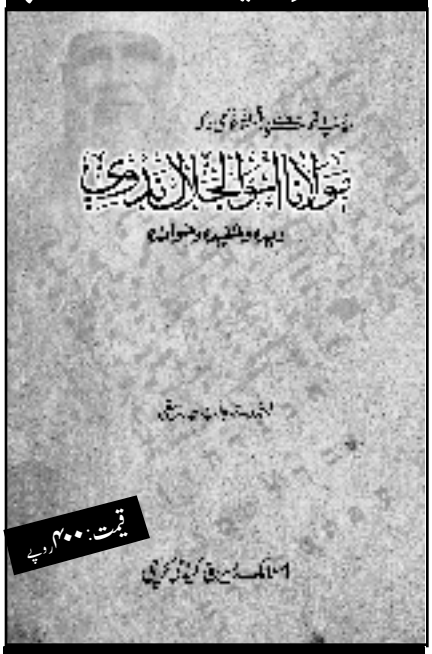

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950